تیز ہوا کا شہر

سفرنامہ باکو (آذربائیجان) | مضامین | افسانے

نیلما ناہید درّانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے، جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

نام　　نیلما ناہید درّانی

والد کا نام　　آغا اعجاز حسین درانی

پیدائش　　۱۵/ اکتوبر۔ لاہور

تعلیم　　ایم اے۔ فارسی

ایم اے۔ صحافت

ایم اے۔ پنجابی

سابقہ روزگار　　پاکستان پولیس سروس (PSP)

ایوارڈز　۱۔　فاطمہ جناح میڈل (۲۰۰۴ء) برائے اعلیٰ شاعری

از گورنر پنجاب بمقام گورنر ہاؤس، لاہور

۲۔　محترمہ فاطمہ جناح گولڈ میڈل برائے اعلیٰ کارکردگی محکمہ پولیس (۲۰۰۵ء)

از وزیر اعظم پاکستان بمقام وزیر اعظم ہاؤس، اسلام آباد

تصانیف:　۱۔ جب تک آنکھیں زندہ ہیں (اردو)

۲۔ جب نہر کنارے شام ڈھلی (اردو)　　۳۔ تمہارا شہر کیسا ہے (اردو)

۴۔ واپسی کا سفر (اردو)　　۵۔ قطرہ قطرہ عشق (اردو)

۶۔ ٹھنڈی عورت (افسانے)　　۶۔ نیلما کی غزلیں (اردو)

۸۔ اداس لوگوں سے پیار کرنا (اردو)　　۹۔ چانن کتھے ہویا؟ (پنجابی)

۱۰۔ دُکھ سجا ایہہ جگ (پنجابی)　　۱۱۔ چاند، چاندنی، چندی گڑھ (سفرنامہ بھارت)

۱۲۔ چڑھدے سورج دی دھرتی (سفرنامہ جاپان)

۱۳۔ بلجیم میں ۲۰ دن (افسانے)　　۱۴۔ جنگل جھیل اور میں (اردو)

۱۵۔ عقیدت (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۱۶۔ راستے میں گلاب رکھے ہیں (اردو شاعری)

سیاحت: بھارت، جاپان، ایران، سعودی عرب، مصر، قطر، بحرین، سوڈان، تھائی لینڈ، ڈنمارک، سویڈن، آذربائیجان، ناروے، فرانس، بلجیم، سپین، برطانیہ۔

ای میل: neelma6@hotmail.com

نیلما ناہید درّانی

زربفت پبلی کیشنز لاہور
کمرہ نمبر 7 دوسری منزل رحمان پلازہ (مچھلی منڈی) اردو بازار لاہور
03034060515 - 03016360741
zarbaftpublications@gmail.com

''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''

تزئین واہتمام: عمران شناور

قانونی مشاورت: میاں محمد اکرام خاں لکھویرا (شہر فرید)

ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، بہاول پور

نام کتاب : تیز ہوا کا شہر

نام مصنفہ : نیلما ناہید درانی

اشاعت : جنوری ۲۰۲۱ء

کمپوزنگ : عبدالباسط

سرورق : عمران شناور

قیمت : ۳۰۰ روپے

بیرون ملک : ۱۰ ڈالر، ۵ پاؤنڈ، ۲۰ ریال

انتساب 1

سال 2020ء اور Covid-19

کے نام

جس نے ساری دنیا کو گھروں میں مقید کر دیا

انتساب 2

تاشقند ازبکستان میں رہنے والی

شہزودہ شہریاررونا

Shahzoda Shahriyarovna

اور جماعت ششم سے تاحال میری سہیلی

صوفیہ تبسم (صوفیہ امجد میر) کے نام

سنو! یہ حالت جنگ ہے

سنو! یہ حالت جنگ ہے
گلی، کوچوں میں دشمن دندناتا پھر رہا ہے
ہمارے گھر وہ بنکر ہیں جہاں رہ کر
ہمیں جنگ جیتنی ہے
ذرا سوچو! یہ بنکر کس قدر محفوظ ہیں
ہر شے میسر ہے
ہوا ہے، روشنی ہے
کھانا، پینا اور سب اپنے ہمارے پاس ہیں
اگر کچھ دن یہاں ٹھہریں تو یہ جنگ جیت جائیں گے
یوں دشمن کو ہرائیں گے
سنو! سوچو تمہارے گھر قبر سے کتنے بہتر ہیں
گھروں میں بیٹھ جاؤ اور دعا مانگو
ہر اک دشمن وبا سے اور بلا سے وہ بچائے گا
جو خالق ہے، جو حافظ
جو اکبر ہے، وہ اللہ ہے

نیلما ناہید درانی

۲۴ مارچ ۲۰۲۰ء

فہرست

افسانے

نیلما ناہید درانی کے افسانے

نیلما ناہید درانی ہمہ جہت قسم کی خوبصورت شخصیت ہیں۔ زندگی میں اگر ایک طرف اس نے پھولوں، ستاروں، خوشبوؤں، بارش، بادل، محبت، پیار کی باتیں کیں تو وہیں دوسری طرف وہ عملی زندگی میں تھانہ، کچہری جیسے ماحول میں سانس لیتی تھی۔ وردی، چور، ڈاکو، گولی، قانون کی باتیں کرنے میں زندگی بتاتی تھیں۔ دو متضاد رویے، شخصیت کے دو روپ اور وہ ہر روپ میں مکمل کامیاب ہیں۔

آج یہاں نیلما کے فن کی جس صنف پر گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ ان کی کہانیوں، ان کے افسانوں کے حوالے سے ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعہ مجھے ملے ''ٹھنڈی عورت'' اور ''ایک حقیقت چند افسانے''۔

سچی بات ہے اس خوبصورت شاعرہ، اس پولیس آفیسر کے اس روپ نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ ان کے پاس عورت اور زندگی کے اتنے مختلف النوع تجربات ہیں کہ ہر کہانی پڑھتے ہوئے جب بندہ اختتام پر پہنچتا ہے تو خود سے پوچھتا ہے...... عورت کو کب کسی نے سمجھا ہے؟...... جب سمجھا تو عورت نے ہی...... اور سچی بات ہے ...... نیلما کی آنکھوں میں فٹ ایکسرے عورت کے بھیتر میں گھس کر اس کا سب کچھ باہر نکال لائے ہیں۔ ان کی ہر کہانی، اس کی نفسیات کی کوئی نہ کوئی گرہ کھولتی ہے۔

''ٹھنڈی عورت'' کو پڑھ لیں۔ اتنا مختصر، اتنا جامع، اتنا بھرپور افسانہ...... دیکھا جائے تو پوری کہانی...... دو مختصر جملوں میں گردش کرتی ہے...... ''اف اتنی ٹھنڈی عورت ہو...... اور پھر...... اف کتنی گرم عورت ہو''۔

واہ نیلما کیا بات ہے...... ''معذوری اور مجبوری'' کو پڑھیں۔ کتنے دوہرے

روپ ہیں انسانی ذات کے۔

''پانچویں منزل کا آخری کمرہ'' بھی ایک منفرد اور اچھوتے سے خیال کو پیش کرنے والا افسانہ ہے۔ ''جنگلی جانور'' بھی کس کمال کی کہانی ہے۔

تلخ حقیقت کا کوڑا برساتی آپ کے ذہن کو زیروزبر کرتی عورت کو اس کی اوقات بتاتی...... سچ تو یہ ہے...... یہ ہر عورت کی کہانی ہے...... تیری کہانی میری کہانی...... ''جنگلی جانور'' ہر گھر میں موجود ہر عورت کے اعصاب پر سوار...... عورت کو ٹٹول لو...... اس کی ذات کا تجزیہ کرلو...... بس یہی کچھ برآمد ہوگا مگر بات اتنی سی ہے کہ اسے اس رنگ اور اس ڈھب میں پیش کرنے کا ہنر صرف نیلما کے حصے میں آیا ہے۔

شاعری کے قطعوں سے سجی یہ کہانیاں جن کی ایک بڑی خوبی ان کا اختصار ہے، سادگی ہے۔ بڑے بڑے بوجھل لفظوں سے قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں ہے۔ کہانیوں میں فضول قسم کے اتار چڑھاؤ پیدا کرنے کی کوئی خودساختہ کوشش نہیں اور لطف کی بات کہ پھر بھی کہانی آپ کو اپنے ساتھ چمٹائے رکھتی ہے اور یہی مصنفہ کا کمال ہے۔ ان کی اس کہانی نے بہت رلایا ''بلجیم میں بیس دن''۔ اسے آپ بیتی کہہ لیں، جگ بیتی کا نام دے دیں۔۔ کہانی تو ہم سب کی ہے۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے بے چاری ماؤں کے ساتھ...... پاکستانی معاشرے کی عورت جو بیٹوں کے لیے مری جاتی ہے...... جسے بیٹی نہیں بیٹا چاہیے...... وہ بیٹا جو اسے آرام سے ماردینا چاہتا ہے...... اور وہ بیٹی جو اسے موت کے منہ سے کھینچ لاتی ہے۔

نیلما ہمیں تم پر فخر ہے...... تم نے ہم سب کی لاج رکھی۔ ہمیں سربلند کیا۔ ہمیں بیٹی ہونے کا فخر دیا...... جیتی رہو...... لکھتی رہو۔

سلمیٰ اعوان

۳۰ اکتوبر ۲۰۱۶ء، لاہور

نیلما ناہید درانی صاحبہ سے نیلما جی تک

نیلما ناہید درانی صاحبہ کے نام سے میں اس وقت متعارف ہوا، جب میں تازہ تازہ یونیورسٹی آف ویلز، کارڈف سے کریمنالوجی میں ایم ایس سی کر کے لوٹا تھا۔ کارڈف میں، برٹش کونسل کے سکالرشپ پر ایک سال گزارنے کے بعد جب 1986ء میں لوٹا تو مجھے کریمنالوجی کے حوالے سے کرائمز برانچ میں بطور SSP تعینات کر دیا گیا۔ ان دنوں دنیا کی مارکیٹ میں نئے نئے کمپیوٹر آئے تھے۔ لاہور میں شاید ہی کسی کے پاس کمپیوٹر ہوگا۔ میں آتے ہوئے اپنی ساری بچت سے ایک کمپیوٹر خرید لایا تھا۔ کمپیوٹر کیا تھا آجکل کے حساب سے وہ محض ایک ورڈ پروسیسر تھا جو مجھے اپنے Msc کے تھیسس کے لیے کارآمد تھا۔ اس کو میں نے اپنے دفتر میں ٹیبل کی زینت بنالیا۔ اب اس کی دھوم پھیلی تو لوگ دور دور سے اسے دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ انہی دنوں مجھے علم ہوا کہ پولیس کے محکمے میں خواتین کو بطور انسپکٹر اور سب انسپکٹر بھرتی کیا گیا ہے بلکہ ان میں سے ایک DSP بھی ہو چکی ہیں۔ بعد میں مجھے اپنے اندر دبے ہوئے ادبی شوق اور اخبارات سے علم ہوا کہ وہ DSP ایک مشہور شاعرہ نیلما ناہید درانی ہیں جن کا پہلا مجموعہ کلام ''جب تک آنکھیں زندہ ہیں'' شائع ہو چکا ہے۔

ایک روز کمپیوٹر دیکھنے کے لیے کچھ خواتین پولیس آفیسرز جتھہ بنا کر میرے آفس آ گئیں۔ میں نے استفسار کیا کہ آپ میں سے نیلما ناہید درانی کون ہیں۔ جواب آیا کہ شاید کسی وجہ سے اس ہلے میں شامل نہیں ہو سکیں۔ مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی لیکن

ان سے نیلما صاحبہ، جو DSP ٹریفک تھیں، کے دفتر کا نمبر لے لیا۔ ایک دو روز بعد ان سے رابطہ کیا اور طبع شدہ کتاب کی تفصیل پوچھی۔ اگلے دن میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب ان کا معروف مجموعہ کلام ''جب تک آنکھیں زندہ ہیں'' میرے نام کے ساتھ دفتر پہنچ گیا۔ گو مجھے شاعری سے اتنا شغف نہیں تھا لیکن میں نے اس کو بہت دلچسپی سے پڑھا۔ اس کے بعد ان کو فون پر ہی عمدہ شاعری کی مبارکباد دی۔ یہ ہمارا پہلا تعارف تھا۔

اس کے بعد وہ بھی ترقی کرتی رہیں اور میں بھی ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر گھومتا رہا۔ شاباش ہے نیلما ناہید درانی پر کہ جب بھی کوئی نئی کتاب شائع ہوئی تو مجھے ضرور بھجوائی۔ اس طرح پتہ چلا کہ وہ نہ صرف ایک عمدہ شاعرہ ہیں بلکہ اچھی سفر نامہ نگار اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کی کتابوں کے حوالے سے اندازہ ہوا کہ وہ ایک ہمہ جہت لکھاری ہیں اور ہر میدان میں اپنا لوہا منوانا جانتی ہیں۔

بہت بعد 2004ء میں میری تعیناتی بطور ایڈیشنل آئی جی، انچارج سپیشل برانچ ہوگئی۔ سٹاف کی تفصیل دیکھی تو پتہ چلا کہ نیلما ناہید درانی بھی ایس ایس پی بن چکی ہیں اور سپیشل برانچ کے ٹریننگ سکول کی پرنسپل کی حیثیت سے چوہنگ پولیس کمپلیکس میں بیٹھتی ہیں۔ ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی۔ پھر میں سپیشل برانچ کو ایک معیاری انٹیلی جنس ایجنسی بنانے پر کمربستہ ہوگیا، جس میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ کی، ہر وقت رابطے میں رہنے کے باعث، مکمل آشیرباد حاصل تھی۔ اس مشن کے لیے میں ہر ماہ اپنے محکمے کے DIG اور SSP صاحبان سے میٹنگ کرتا تھا جس میں نیلما ناہید درانی بھی اپنے تعمیری خیالات کے ساتھ بھرپور حصہ لیتی تھیں۔ میں نے چوہنگ سکول کا دورہ کیا تو جو پذیرائی ملی میں اسے آج تک نہیں بھلا سکا۔

جہاں میں ان کی ادبی قابلیت کا معترف تھا وہاں ان کی انتظامی صلاحیتوں نے

بھی بے حد متاثر کیا۔ انتظامی مشاورت تو تھی ہی، سوچا کیوں نہ ان کی ادبی قد آور شخصیت کو بھی استعمال کیا جائے۔ ایک میٹنگ میں سپیشل برانچ کے اپنے ماہانہ ادبی مجلّے کو ایجنڈے پر رکھا۔ آئیڈیا سب نے پسند کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مدیر بننے کی خوبی نیلما ناہید درانی کے علاوہ اور کس میں ہو سکتی تھی محکمے کے فرائض کے حوالے سے اس کا نام بھی ''راز داں'' رکھا گیا۔ اپنے طویل اشاعتی تجربے کی روشنی میں صرف چند روز میں ہی انہوں نے تمام انتظامات مکمل کر لیے۔ ایک خوبصورت رسالے کا پہلا شمارہ لے کر جب نیلما ناہید درانی میرے دفتر آئیں تو ہم دونوں کی خوشی دیدنی تھی۔ اس میں محکمے کے متعدد افسران نے اپنے پوشیدہ ادبی جوہر دکھانے شروع کیے۔ نیلما ناہید درانی کو تو بہ امر مجبوری ہر ماہ کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا تھا اور غالباً ان کو مدیر بنانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ جب تک میں سپیشل برانچ میں رہا یہ رسالہ چھپتا رہا۔

سپیشل برانچ سے ہی میں ریٹائر ہو گیا۔ سوچا اب اپنے بچپن کے شوق، مصوری کی خواہش کو پورا کروں گا۔ نیلما ناہید درانی نے ایڈوانس میں اپنے پورٹریٹ کی بکنگ بھی کروالی۔ شاید قدرت کو منظور نہیں تھا۔ مجھے اسلام آباد میں میرے بینکنگ کے سابقہ تجربے کی روشنی میں عمدہ عہدہ مل گیا۔ زندگی پھر مصروف ہو گئی اور شوق دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جب میں نے تین سالہ معاہدے کی مزید تجدید سے انکار کیا تو اسے میں اپنی اصل ریٹائرمنٹ سمجھتا ہوں۔ اب میں آزاد تھا۔ اس دوران نیلما ناہید درانی صاحبہ سے رابطہ نہ رہا۔ بھلا ہو فیس بک کا، ہم نے ایک دوسرے کو ڈھونڈ نکالا۔ اس عرصے میں وہ بھی ریٹائر ہو چکی تھیں۔

نئی زندگی کے لیے میں نے سیاحت اور لکھنے کا شوق پورا کرنے کے بارے میں سوچا، جس میں نیلما ناہید درانی نے میری بھرپور حمایت کی۔ پھر لاہور کی ادبی تقاریب میں انہوں نے مجھے مدعو کرنا شروع کر دیا۔ کبھی الحمرا کی ادبی بیٹھک میں اور کبھی اکادمی

ادبیات کے ہال میں۔ آزاد ہونے کے بعد سب سے پہلا دورہ میں نے ازبکستان کا کیا۔ جب میں نے سفرنامہ لکھنے کے بارے میں سوچا تو میں نے رہبری کے لیے نیلما ناہید درانی کو منتخب کیا، کیونکہ انہوں نے عمدہ شاعری کے علاوہ خوبصورت سفرنامے بھی لکھے تھے۔ گو وہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹی ہیں لیکن وہ میری روحانی استاد بن گئیں اور میں نے ان کو نیلما جی کہنا شروع کر دیا۔ قدم قدم پر ان سے مشورے لیتا اور ان کے تجربے کی روشنی میں اپنی اصلاح کرتا۔ پھر یہ رسم ہو گئی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنی کتاب شائع ہونے سے پہلے مسودے بھجواتے۔ میں تو ضرورت کے تحت اور وہ تکلفاً بھجواتیں کیونکہ ان کو کوئی مشورہ دینا گویا سورج کو چراغ دکھانا تھا۔ میرا پہلا سفر نامہ ''ازبکستان: حضرت امام بخاری اور امیر تیمور کا دیس'' ان کی مستقل رہبری اور حوصلہ افزائی کا مرہون منت ہے۔ عنوان، ٹائٹل، انتساب، مضمون اور حتیٰ کہ اشاعت کے مراحل میں بھی ان کی رہبری نے میرے حوصلے بلند رکھے۔ شکریہ نیلما جی کہ بالآخر کتاب چھپ کر منظر عام پر آ گئی۔ میں نے ان سے تقریب رونمائی کی نظامت کا وعدہ لیا بلکہ خود ان کی خواہش بھی یہی تھی۔

ان کی ایک رسم، عادت یا مجبوری میری خواہشوں کے خلاف جاتی ہے کہ وہ سردیوں میں لندن چلی جاتی ہیں۔ قسمت کی بات ہے کہ تقریب رونمائی میں نے دسمبر میں کی اور وہ شامل بھی نہ ہو سکیں، نظامت تو دور کی بات۔ ہر دفعہ میرے ساتھ یہی ہوتا رہا۔ کچھ ایسا ہی میرے دوسرے سفرنامے ''ترکی میں پاشا'' کے ساتھ ہوا۔ اس کی تقریب رونمائی بھی دسمبر میں ہی تھی۔ اس کی کمی انہوں نے ایسے پوری کی کہ سفر نامے پر ایک خوبصورت مضمون لکھا جو میں نے تقریب میں اپنی شازی باجی سے نیلما جی کے نام پر پڑھوایا۔ یاد رہے شازی باجی خود بھی اس سفرنامے کا ایک کردار ہیں۔ اس مضمون کو تقریب میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔

انہوں نے ایک ادبی تنظیم ''راستی'' بنائی ہوئی ہے جو اکثر ادبی محفلیں منعقد کرتی رہتی تھی۔ ''تھی'' کا صیغہ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اس نامراد کرونا کی وجہ سے نہ صرف ادبی محفلیں اجڑ گئیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ دوسری قدآور شخصیتوں سے ملاقات کے مواقع بھی ختم ہو گئے۔ نیلما جی بھی لندن جا کر پھنس گئیں اور گرمیوں میں بھی واپس نہ آسکیں۔ اب دوسری سردیاں ہو گئی ہیں۔ اب نئے سرے سے لاک ڈاؤن کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اللہ اس آفت سے جلد نجات دلائے تاکہ نیلما جی واپس آئیں اور ادبی محفلیں دوبارہ سجیں۔

اسی دوران میرا تیسرا سفرنامہ ''نیل کے سنگ'' بھی چھپ کر منظر عام پر آ گیا۔ حسب معمول اس میں بھی ان کی رہبری آن لائن چلتی رہی۔ اس کی تقریب رونمائی Covid-19 کی وجہ سے ابھی تک نہیں ہو سکی ورنہ شاید اب بھی وہ شامل نہ ہو سکتیں۔ اب میں نے سوچا ہے کہ یہ تقریب ہی تب ہو گی جب نیلما جی اپنے پیارے پاکستان میں ہوں گی۔

مجھے یاد ہے کہ ان کی سب سے بعد میں آنے والی کتاب ''بلجیم میں 20 دن'' کی تقریب رونمائی الحمرا ادبی بیٹھک میں ہوئی تھی جس میں انہوں نے مجھے اور نوشی گیلانی صاحبہ کو بطور مہمان خصوصی بلایا۔ یہ کتاب جو تلخ حقیقتوں اور افسانوں کا مجموعہ ہے، انتہائی پر اثر اور المناک داستان ہے۔ اس کو پڑھ کر بہت دنوں تک میں افسردہ رہا کیونکہ اس میں انہوں نے اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ گزرے ہوئے 20 دنوں کا ذکر کیا تھا۔ اس کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ صرف بیٹیاں ہی ایسی مخلوق ہیں جو ماں سے حد درجہ محبت بلا کسی غرض کے رکھتی ہیں ورنہ عام طور پر بیٹے، سوائے چند کو چھوڑ کے، وہ درجہ نہیں پا سکتے۔

میں نے ان کی کتاب ''ٹھنڈی عورت'' بھی ایسی کیفیت میں پڑھی ہے کہ ہر

افسانہ پڑھنے کے بعد کچھ دیر کے لیے میں مسمرائز سا ہو جاتا تھا۔اس کی ٹرانس سے نکلنے تک میں اگلا افسانہ شروع نہیں کر سکتا تھا۔مختصر مختصر افسانوں میں انہوں نے عورت اور مرد کی نفسیات کو اس باریکی سے بیان کیا ہے کہ سگمنڈ فرائیڈ بھی پڑھے تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔وہ روزمرہ کی کہانیاں چار پانچ صفحات میں بیان کر دیتی ہیں جبکہ دوسرے مصنف اسی مفہوم کو طویل ناول لکھ کر بھی قاری کو تشنہ رکھتے ہیں۔

افسانہ ''یادیں اور برساتیں'' ناصر کے کردار اور عورت کی نفسیات کے گرد گھومتا ہے۔وہ ناصر کو پسند بھی کرتی ہے لیکن اظہار نہیں کرتی اور بعد میں پچھتاوا،نفسیات کا مکمل باب ہے۔ ''جنگلی جانور'' میں لال جوڑے کا جس انداز میں ذکر اور مرد کو ریچھ سے تشبیہ دی گئی ہے وہ ایک ماہر نفسیات ہی دے سکتا ہے۔میرے خیال میں عام زندگی کے عمیق مشاہدے نے ان کو ایسا بنایا ورنہ ماسٹرز تو انہوں نے جرنلزم میں کیا ہوا ہے۔ ''کرنوں کی سیر'' ایک عورت کی خیالی اور اندھی محبت کی کہانی ہے جس پر زوردار ہتھوڑا تب پڑتا ہے جب محبوب ایک کپڑے کا دوکاندار نکلتا ہے۔ ''نئی عورت نیا مرد'' ائیر لائن سے جڑی کہانی ہے جس کی تشریح کے لیے ایک جملہ ہی کافی ہے، ''ایک روز جہاز نے زمین پر ہی اترنا ہوتا ہے'' ۔ ''فٹ پاتھ کا بچہ'' میں ایک پاگل عورت کے ناجائز بچے کو موضوع بنایا گیا ہے۔عورت کی شادی شدہ زندگی کے بارے میں ''گناہگار کون'' عمدہ افسانہ ہے۔ان سب سے الگ ہٹ کر'' پانچویں منزل کا آخری کمرہ'' دہشت گردی کے عفریت کے گرد گھومتا ہے۔مختلف مقامات پر انہوں نے شاعری کا تڑکا بھی لگایا ہے۔(معذرت کے ساتھ:وہ کہتے ہیں نا کہ چور چوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے نہیں۔یہ ازراہ مذاق بات تھی ورنہ بہت عمدہ بند اور نظمیں قند مکرر کا کام کر رہی ہیں۔) ''روزی'' ایک سگے رشتوں کی ڈنگی ہوئی لڑکی کی کہانی ہے جس میں مصنفہ نے بعد میں کسی اور حوالے سے شوہر کو بھی شامل کر لیا۔گویا دنیا کے

محبت کے تمام رشتے ناپائیدار ہیں۔ ''آسمان سے زمین پر'' سلمنگ کی شوقین لڑکیوں کے لیے انوکھا سبق ہے۔ ''معذوری یا مجبوری'' پر احساس ہوا کہ نیلما جی کا مشاہدہ کس قدر وسیع ہے۔ ایک مرد کی جنسی نفسیات جاننا کم از کم کسی خاتون کے لیے تو ممکن نہیں ہے۔ سری لنکا اور بدھ مت کے پس منظر میں اسلام آباد کا افسانہ، ایک وجیہہ نوجوان، چنت تلک رتنا کی کہانی ''راون کی قید میں'' بھی بہت پر اثر ہے۔

''ٹھنڈی عورت'' افسانہ جو کتاب کا عنوان بھی ہے، اگر آج سے 30 سال پہلے چھپا ہوتا تو شاید منٹو کے ''ٹھنڈے گوشت'' اور ''کھول دو'' کی بجائے اس پر فحش نگاری کا الزام لگتا۔ عورت کی سب سے لطیف نفسیات کو الفاظ میں ڈھالنا انتہائی مشکل کام ہے جو نیلما جی نے صرف دو الفاظ ''ٹھنڈی'' اور ''گرم'' میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اور یقیناً اس ٹھنڈی اور گرم کا ذمہ دار بھی مرد ہی ہے۔

اگلے افسانے ''انس+محبت+عشق'' کا جہاں عنوان انوکھا ہے، وہاں اس کا فلسفہ بھی عجیب ہے۔ یہ افسانہ کم اور معرفت کی کہانی زیادہ ہے۔ مرد کی نفسیات کا ایک اور مشاہدہ ہے۔ ''پھر چلے جانا'' مرد اور عورت کے احساسات اور جذبوں کا ایک تقابل ہے اور نفسیات کی ایک اور کڑی۔ ''سیکنڈ ہینڈ'' میں لنڈے کی اور دوسری پرانی چیزیں پسند کرنے والی ''روما'' کو منگیتر بھی سیکنڈ ہینڈ ملتا ہے۔ ''بھاگوان'' معاشرے کی ایک دکھتی رگ ہے جس میں عورت کے ہاں صرف بیٹیاں پیدا ہونے پر اس کو منحوس ہونے کے طعنے دئے جاتے ہیں۔ ایک باریک نقطہ یہ سمجھاتا ہے کہ کیا اس میں صرف عورت ہی اکیلی ذمہ دار ہے؟ ''خیال یار سے پہلے'' معرفت کے عشق کی کہانی ہے جبکہ ''کیا جواب دے؟'' فرقہ واریت کے خوفناک انجام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

جس طرح مشاعرے میں سب سے سینئر شاعر آخر میں کلام سناتا ہے اور تقریب میں صاحبِ صدر سب سے آخر میں خطاب فرماتے ہیں، اسی طرح نیلما جی کا سب

سے خوبصورت اور اچھوتے خیال والا افسانہ ''عشق نہ پچھے ذات'' آخری ہے۔ حقیقت پوچھیں تو مجھے ذاتی طور پر یہ سب سے زیادہ اچھا لگا۔ ''زونی'' اور ''یوسف'' کے کردار بہت انوکھے ہیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کرنے والی خوبصورت حسینہ بالآخر ایک کالے کلوٹے یوسف کے صرف موتیوں جیسے دانتوں پر مرمٹتی ہے۔

نیلما جی کا یہ افسانوں کا مجموعہ، عورت کے جذبات اور مرد کے رویے پرشاکی ہونے کے اردگرد گھومتا ہے۔ اس میں کچی مٹی کی خوشبو بھی ہے اور بارشوں کی رم جھم بھی، جو کبھی موسلا دھار بھی ہو جاتی ہے۔

اب آتے ہیں زیرِ نظر کتاب ''تیز ہوا کا شہر'' کی طرف۔ اس کو میں کیا کہوں؟ سفر نامہ، افسانوں کا مجموعہ یا مضمون نگاری۔

باکو (آذربائیجان) کا سفر نامہ، پہلا حصہ ہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ نیلما جی بار بار مجھے باکو کی سیاحت کے بارے میں کہتی تھیں۔ یہ میرے ایجنڈے میں باقاعدہ شامل بھی تھا لیکن کرونا نے تمام پروگرام ملیا میٹ کر دئے۔ چلیں اسی بہانے ہم نے جانے سے پہلے ہی باکو کی تفصیلی سیر کرلی اور جب جائیں گے تو یہ کتاب گائیڈ کا کام دے گی۔ جب میں نے فہرست مضامین دیکھی تو سب سے پہلے باکو کا حصہ تھا۔ ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کتاب کا انتساب تو ایک ازبک سہیلی شہزودہ شہریار کے نام تھا جبکہ اصولاً اسے کسی آذری لڑکی کے نام ہونا چاہئے تھا۔ بہرحال اسی مخمصے میں سفر نامہ شروع کیا تو پہلے ہی باب میں یہ گتھی سلجھ گئی لیکن اس کی تفصیل نہیں بتاؤں گا کہ اس طرح مستقبل کے قاری کا سسپنس ختم ہو جائے گا۔

نیلما جی نے باکو کو ایک سیاح کی نسبت ایک لکھاری کی نظر سے زیادہ دیکھا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے جو چیز نوٹ کی وہ ہے آذربائیجان کے لوگوں کا اپنے شاعروں اور ادیبوں سے پیار۔ اپنے شہروں، سڑکوں اور انڈر گراونڈ سٹیشنوں کے نام

ان کے ناموں پر رکھتے ہیں۔ ماضی میں ادیب اور شاعر، ملک کے سربراہ کی حیثیت تک گئے۔ شاہ اسماعیل خطائی نے ایک عظیم الشان صفوی حکومت کی بنیاد رکھی۔ وہ مشہور زمانہ سرخانی کی قدیم آتش گاہ بھی گئیں جہاں صدیوں سے آگ روشن ہے۔ اس کی مکمل تاریخ اور پارسیوں سے نسبت بیان کی گئی ہے۔ قصہ لیلیٰ مجنوں کے خالق ''فضولی'' کا بھی بھرپور تذکرہ ہے۔ ''نظامی گنجوی'' پر ان کا پورا ایک باب ہے۔

مضامین کے حصے میں سے بیشتر میں پہلے ہی فیس بک پر پڑھ چکا ہوں۔ یہ تحریریں، مضامین کم اور سرگزشت اور خودنوشت زیادہ لگتے ہیں جو یقیناً قاری کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ فیس بک پر ان کی ذاتی، پیشہ ورانہ اور ادبی زندگی کے حوالے سے قسط وار مضامین آتے رہے ہیں جن کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ بہت جلد ان کی خودنوشت بھی کتابی شکل میں شائع ہو جائے گی۔ افسانوں کا حصہ حسبِ معمول بہت عمدہ ہے۔ ان پر بھی سرگزشت کا گمان ہوتا ہے۔ ان پر تفصیلی بحث اس لیے نہیں کروں گا کہ قاری ان کو خود ہی پڑھ لے گا۔

آخر میں یہی دعا ہے کہ اللہ نیلما جی کو صحت مند لمبی زندگی عطا فرمائے، زورِ قلم اور زیادہ کرے اور وہ جلد پاکستان آ کر ادبی رونقیں بحال کریں۔ آمین۔

طاہر انوار پاشا

(ایڈیشنل انسپکٹر جنرل پولیس ریٹائرڈ)

۲۲ دسمبر ۲۰۲۰ء، لاہور

سفرنامہ باکو

(آذربائیجان)

بسا منکر کہ آمد تیغ در مشت
مرا زد تیغ و شمع خویش را کشت

(نظامی گنجوی)

ازبک پری سے ملاقات......

2008ء کے شروع میں ہی میرا نیلے رنگ کا پاسپورٹ بن گیا تھا۔ اس پر بہت سے ممالک میں بغیر ویزا جانے کی سہولت تھی۔ لیکن 2008ء ستمبر میں عمرہ کی ادائیگی کے لیے مجھے عمرہ ویزہ لگوانا پڑا۔ یو این مشن پر جانے سے پہلے۔ ویزہ فری سفر کرنے کا تجربہ بھی کرنا تھا۔ بہت سارے یورپی ملک بھی تھے مگر میں نے آذربائیجان جانے کا ارادہ کیا۔ پرستان اور پریوں کے دیس۔ جب سکول کے زمانے میں۔ گرمی کی چھٹیاں ہوتیں۔ گرم دوپہروں میں گھر کے افراد کھڑکیوں پر خس کی چادریں لٹکا کر پنکھوں کے نیچے سو رہے ہوتے۔ ہم نے کئی بار درختوں کے نیچے جا کر پریوں کو آوازیں دی تھیں۔ نیلی پری آ جاؤ۔ لال پری ہمارے ساتھ کھیلو۔ سبز پری جھولا جھلاؤ۔ لیکن کوئی جواب نا آتا۔ اتنے میں گھر کے افراد جاگ جاتے اور بچوں میں سب سے بڑا ہونے کے باعث مجھے ہی ڈانٹ پڑتی کہ گرمی کی دوپہر میں پھرنے سے لو لگ جائے گی۔ بخار ہو جائے گا۔

ہاں تو ہم جا رہے تھے پریوں کے دیس ''آذربائیجان''۔ ہوائی جہاز کی ٹکٹ لینے کا مرحلہ آیا تو پتہ چلا ازبک ایئر لائن سب سے سستی ہے۔

دو ٹکٹیں خریدیں اور سامان باندھ لیا۔ اپریل کا مہینہ تھا مگر گرم کپڑے رکھ لیے۔

کیونکہ وہاں موسم سرد تھا۔

لاہور ایئر پورٹ پر از بک ایر لائن کی لائن میں کئی نو جوان لڑکے دکھائی دیئے۔ خواتین کی تعداد نا ہونے کے برابر تھی۔

جہاز پر سوار ہوئے تو خوبصورت ایئر ہوسٹسز نے خوش آمدید کہا۔

اس جہاز نے ہمیں تاشقند کے ہوائی اڈے پر اتار دیا۔

ہوائی اڈا کیا تھا۔ایک چھوٹی سی عمارت تھی۔ٹرانزٹ ہال ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اور ایک مختصر سی دکان پر ڈیوٹی فری شاپ لکھا ہوا تھا۔جس میں چند چاکلیٹ،سگریٹ اور سووینئر پڑے تھے۔

لاہور سے آنے والے لڑکے بھی اسی ٹرانزٹ ہال میں بیٹھے تھے۔اور وہ بہت خوفزدہ لگ رہے تھے۔ایک فیملی کسی سرکاری افسر کی تھی جو آذر بائیجان ایمبیسی میں کام کرتا تھا۔ان کے پاس بھی ہماری طرح نیلے رنگ کے پاسپورٹ تھے۔

ٹرانزٹ ٹائم چار گھنٹے تھا۔مگر یہ وقت گزارنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔کئی بار اس ایئر پورٹ کی عمارت میں۔جہاں تک مسافروں کو جانے کی اجازت تھی کا چکر لگایا۔ ڈیوٹی فری میں جھانک کر کچھ خریدنے کے لیے دل کو آمادہ کرنے کی کوشش کی۔اور پھر یہ سوچ کر خود کو خوش کر لیا کہ ہمارے پاکستان کے ایئر پورٹس اس کی بہ نسبت بہت اچھے ہیں۔ہم لوگ ہی ناشکرے ہیں جو اپنی چیزوں کی قدر نہیں کرتے اور للچائی نظروں سے ترقی یافتہ قوموں سے اپنا مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔

جب ہم چار بار کافی پی چکے اور تھک کر ایک کونے والی نشست پر بیٹھ گئے۔اب بوریت کی انتہا ہو چکی تھی۔میں جو زندگی کے ہر سفر کو،وہ خواہ اردو کا ہو یا انگریزی کا، ہمیشہ ایک ایڈونچر کی طرح لیتی ہوں۔سچ مچ بوریت کا شکار ہو چکی تھی۔اسی وقت وہ مجھے اپنی طرف آتی دکھائی دی۔نیلے سکرٹ نیلی ٹوپی پہنے،شربتی آنکھوں اور گھنے لمبے

بالوں والی، وہ کوئی پری ہی تو تھی۔ وہ چلتی ہوئی میرے پاس آ کر رک گئی۔ اب وہ مسکراتے ہوئے مجھے سلام کر رہی تھی۔ میرا حال پوچھ رہی تھی۔

میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ اردو میں میرے ساتھ مخاطب تھی۔

''میرا نام شہزودہ ہے۔ شہزودہ شہریار روونا، میں ازبک ایئرپورٹ ٹرانزٹ ہال کی ایجنٹ ہوں۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں''۔

میں نے دیکھا اس کے ہمراہ دو مرد آفیسر بھی تھے لیکن وہ اردو نہیں جانتے تھے۔

''آپ نے اردو کیسے سیکھی؟''۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں نے دو سال کراچی میں گزارے ہیں۔ میرے والد وہاں ازبک ایئر لائن کے جنرل مینیجر تھے۔ 1992ء سے 1994ء تک ہم لوگ۔ کلفٹن روڈ پر رہے پھر تاشقند آ گئے۔ میرا بچپن افغانستان اور ماسکو سینٹ پیٹرزبرگ میں گزرا ہے۔

1999ء میں میں نے تاشقند اورینٹل انسٹیٹیوٹ سے اردو اور ہندی کی تعلیم حاصل کی ہے۔

2003ء سے میں تاشقند ایئرپورٹ کے ٹرازٹ ہال میں بطور ایجنٹ کام کر رہی ہوں۔ ابھی میری ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے۔ میں صرف آپ سے ملنے آئی ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ خوبصورت، باوقار۔ اب وہ میری تعریف کر رہی تھی۔ میری بوریت اور تھکن دور ہو چکی تھی۔ میں نے اس کو اپنی دو کتابیں دیں جن کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسکراہٹ میں نور کی پرچھائیں اور بڑھ گئی۔ اس نے جاتے ہوئے میرا شکریہ ادا کیا اور مڑ کر کہا۔ آپ دنیا میں میری پسندیدہ ترین خاتون ہیں۔

ہماری آذربائیجان کی فلائٹ کا ٹائم ہو چکا تھا۔ اگلا سفر اس سچ مچ کی پری کی یاد میں گزر گیا اور ہم باکو کے ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔

شاہ اسماعیل خطائی کے دیس میں

باکو میرا پسندیدہ ترین شہر ہے۔ مجھے دنیا کے بہت سے خوبصورت شہروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ٹوکیو، بنکاک، استنبول، لندن، تہران، بارسلونا، اوسلو، برسلز، کوپن ہیگن، سٹاک ہوم، پیرس اور بہت سے مگر مجھے آذربائیجان کا شہر باکو سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کی پسندیدگی کی وجہ لوگوں کے حسن و جمال کے علاوہ ان کا حسن ذوق، حس لطافت، ادب، آرٹ، تہذیب اور ثقافت ہے۔

جس کے مظاہر باکو میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شہر کے علاقوں کے نام آذربائیجان کے ادیبوں شاعروں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ نظامی، فضولی، شاہ اسماعیل خطائی۔ اور جب آپ اس علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کو ان مشاہیر کی تصاویر بڑی بڑی پینٹنگز کی صورت میں دکھائی دیتی ہیں۔ بلکہ چوک میں ان کے مجسّمے بھی نصب نظر آتے ہیں۔ جن کو گردن اٹھا کر دیکھنا پڑتا ہے۔ ان مجسّموں کے قدموں کے قریب رکھے بنچوں پر بیٹھ کر آپ آنے جانے والی ٹریفک کا نظارہ کر سکتے ہیں۔

یہاں کے لوگ صرف شکل وصورت اور قد و قامت میں ہی خوبصورت نہیں بلکہ اپنی گفتار، اطوار اور نفاست میں بھی بے مثل ہیں۔ ادب آداب اتنا کہ مسافر بسوں

اور ٹرین میں بچوں اور خواتین کو بٹھانے میں ترجیح دی جاتی ہے۔ پہلے سے بیٹھے نوجوان بزرگوں، خواتین اور بچوں کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔

مجھے نظامی گنجوی کی کشش باکو لے آئی تھی۔ جس کی مثنوی ''خسرو شیریں'' میں زمانہ طالب علمی میں پڑھ چکی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے عمر خیام کا مزار دیکھنے نیشا پور، غالب اور امیر خسرو کے مزار دیکھنے بستی نظام دین دہلی اور شیکسپیئر کا شہر stratford upon avon دیکھنے برطانیہ پہنچی تھی۔

باکو شہر کے سب سے خوبصورت اور مہنگے علاقے کا نام گنجوی ہے۔ ہمارے ہاں تو ڈیفنس کو سب سے خوبصورت کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک شاعر سب سے خوبصورت علاقے کی پہچان ہے۔ جس کی بڑی بڑی تصاویر ٹرین اسٹیشن کی دیواروں پر نقش ہیں۔ ٹرین اسٹیشن سے نکلتے ہی گنجوی کا دیو ہیکل مجسمہ نظر آتا ہے۔

ہم جس علاقے میں ٹھہرے تھے۔ اس کا نام نریمان نرماو تھا۔ یہ بھی ایک شاعر اور ادیب تھا جو یہاں کا حکمران بھی رہ چکا تھا۔ ہم ایک پاکستانی فیملی کے paying guest تھے۔ یہ فیملی ایک نوجوان لڑکی اور اس کے ماموں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے ایک عمارت کرایہ پر لے رکھی تھی۔ جس کے کمرے کرایہ پر دیتے تھے۔ لڑکی مہمانوں کے لیے کھانا بھی بنا دیتی جس سے ان کا کچن چل رہا تھا۔ ان کا تعلق پاکستان کی مسیحی برادری سے تھا۔ ایک روز ایک ادھیڑ عمر جرمن ان کی بستی میں آیا اور ایک نوعمر لڑکی سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ جس پر مختلف لڑکیاں اس کو دکھائی گئیں۔ اس نے اس لڑکی کو پسند کیا۔ تمام مذہبی اور ثقافتی رسومات کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے شادی کی تقریبات ہوئیں۔ جس کے سارے اخراجات اس جرمن نے ادا کیے۔ اور پھر اس لڑکی کو جرمن بلانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ کچھ عرصہ خرچہ بھیجتا رہا۔ پھر وہ بھی بند ہو گیا۔ جب رشتہ داروں کے استفسار طعنوں میں بدلنے لگے تو لڑکی کا ماموں اس کو لے کر

آذر بائیجان آ گیا۔اب یہ لوگ یہاں سے جرمنی جانے کے طریقے ڈھونڈ رہے تھے۔
یہ ساری باتیں بتاتے ہوئے اس لڑکی نے مجھے اپنی شادی کی تصاویر بھی دکھائیں۔
اور کہا کل ہمارے ساتھ چرچ چلیں۔اتوار کو چرچ کی سروس کے بعد ہم نے پادری
سے ملاقات کرنی ہے۔دوسری صبح میں ان کے ساتھ شاہ اسماعیل خطائی روانہ ہوئی۔
ٹرین کے ذریعے وہاں پہنچے۔شاہ اسماعیل خطائی کا مجسمہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا
تھا۔یوں لگتا تھا جیسے ساری ٹریفک اس کا طواف کر رہی ہو۔ایک اور ادیب سے
تعارف ہوا۔

چرچ بہت بڑا اور خوبصورت تھا۔بہت سے مقامی اور غیر ملکی لوگ جمع تھے۔
چائے اور ناشتہ کا انتظام بھی تھا۔سروس اور دعا کے بعد وہ دونوں ماموں بھانجی پادری
کے کمرے میں اپنی عرضداشت کے لیے چلے گئے۔میں چرچ کے باہر خوبصورت
فواروں اور رنگ برنگ پھولوں کے درمیان استادہ شاہ اسماعیل خطائی کے مجسمہ کو
دیکھتے ہوئے آذر بائیجان کے ادیبوں شاعروں کی قسمت پر رشک کر رہی تھی۔

صفوی حکومت کی بنیاد رکھنے والا شاعر: شاہ اسماعیل خطائی

بحیرہ گیلان، بحیرہ کیسپین، دریائے خزر دنیا بھر میں پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔اس کے اردگرد وسطی ایشیا کے ممالک آباد ہیں۔ایران، قازقستان، روس، ترکمانستان اور آذربائیجان۔اس کا سب سے طویل کنارہ آذربائیجان کے ساتھ ہے۔ باکو کے خوبصورت علاقوں میں ایک علاقے کا نام ''ساحل'' ہے۔اسی طرح ایک علاقہ صفوی خاندان کی بنیاد رکھنے والے حکمران، ترکی، فارسی اور آذری میں شاعری کرنے والے شاہ اسماعیل کے نام ہے۔جن کا تخلص ''خطائی'' تھا۔

اس علاقے کو''شاہ اسماعیل خطائی'' کہتے ہیں۔

شاہ اسماعیل خطائی 17 جولائی 1487ء میں پیدا ہوئے۔

23 مئی 1524ء میں ایران کے شہر تبریز میں وفات پائی۔ان کی عمر صرف 37 برس تھی۔مگران کی فتوحات نے ان کی سلطنت کو اتنا وسیع کر دیا کہ ایران، آذربائیجان، آرمینیا، جارجیا، عراق، کویت، افغانستان، شام، ترکی، پاکستان، ازبکستان، ترکمانستان اور روس کے کئی علاقے اس میں شامل ہو گئے۔

شاہ اسماعیل خطائی نے''صفوی'' سلطنت کی بنیاد رکھی۔اور 1501ء سے 1524ء تک شہنشاہ ایران کی حیثیت سے حکومت کی۔شیعہ اثنا عشری مسلک کو

سرکاری مذہب قرار دیا۔ فارسی کے ساتھ ترکی کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا۔
شاہ اسماعیل کا تعلق ایران کے علاقے اردبیل سے تھا۔ شاہ اسماعیل کا خاندان محلاتی سازشوں کا شکار ہوا۔ بچپن میں والدہ اور بھائیوں کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ والد اور بھائی کی وفات کے بعد ''ریڈ ہیڈ مومنٹ'' کے سربراہ بنے۔ یہ لوگ لال رنگ کی ٹوپیاں پہنتے تھے۔
اپنے دور حکومت میں انہوں نے عوام کی فلاح و بہبود اور ادب و ثقافت کے فروغ کو اپنا مشن بنایا۔ اپنی مادری زبان میں نظم، غزل اور مثنویاں لکھیں۔ ان کے مذہبی کلام نے سنی ایران کو شیعہ ایران میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کا زیادہ کلام فارسی اور آذربائیجانی زبان میں ہے۔ انہوں نے 1400 سے زائد نظمیں لکھیں۔ جن میں سے پچاس اب تک زندہ ہیں۔ ان کی پہلی نظم کا عنوان ''دہ نامہ'' تھا۔ اپنی فارسی غزلوں کا دیوان بھی مرتب کیا۔ ان کی شاعری کی زبان سادہ اور عام فہم تھی۔ اس لیے ان کے فارسی، آذربائیجانی اور ترکی کلام نے عوام میں مقبولیت حاصل کی۔
شاہ اسماعیل خطائی بھی شاہنامہ فردوسی سے متاثر تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کے نام ''شاہنامہ فردوسی'' کے مختلف کرداروں پر رکھے۔
محمد شابانی ازبک کو شکست دینے کے بعد شاہ اسماعیل نے خراسان کے شاعر جام کو اس فتح کا شاہنامہ لکھنے کا کہا۔ لیکن یہ شاہنامہ ان کی زندگی میں ادھورا ہی رہا۔
شاہ اسماعیل خطائی کی شاعری کے موضوعات محبت اور تصوف تھے۔ ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ نمایاں تھا۔ انہوں نے آذربائیجانی زبان میں اپنے بیٹے طہماسپ کے لیے ''نصیحت نامہ'' بھی لکھا۔ خطائی کے نام سے منسوب آذربائیجان کے دارالحکومت باکو میں ایک خوبصورت علاقہ ہے جہاں بڑے سے پارک اور سکوائر

میں ان کا مجسمہ استادہ ہے۔کئی گلیاں محلے بھی ان کے نام سے منسوب ہیں۔ یہ شاعر جس نے ایک عالی شان حکومت کی بنیاد ڈالی۔ 23 برس تک وسیع وعریض خطہ زمین پر حکومت کی۔ ایران کے علاقے اردبیل میں شیخ صفی کے مقبرے میں آسودہ خاک ہے۔

آذربائیجانی اس کو اپنا ادیب اور شاعر مانتے ہیں۔ اوراس کی تکریم کرتے ہیں۔ میں سوچ رہی تھی کیا یہ ہمارا شاعر نہیں تھا۔ ہمارا خطہ زمین اس کی سلطنت میں شامل تھا۔ہم اپنی تاریخ اورادب وثقافت کو اپنی اگلی نسلوں تک ــــ کیوں نہیں پہنچانا چاہتے۔صفوی دور حکومت تاریخ کا اہم ترین دور رہا ہے۔مگر کتنے لوگ اس عظیم شہنشاہ کے بارے میں جانتے ہیں۔جس کا نام شاہ اسماعیل اور تخلص خطائی تھا۔یعنی خطا کار، غلطی کرنے والا۔اس کی اسی عاجزی نے اس کو آج بھی زندہ رکھا ہوا ہے۔

''نریمان نرماوو'' انقلابی ادیب، مفکر، سیاستدان، حکمران

ہم جس علاقے میں رہ رہے تھے۔اس کا نام نریمان نرماوو تھا۔ یہ باکو شہر کا تجارتی علاقہ تھا۔ اس میں دکانیں، بازار اور دفاتر تھے۔ یہاں کا ٹرین اسٹیشن بڑا تھا اور اس میں ہر وقت آمد و رفت رہتی تھی۔ بازاروں سڑکوں پر بھی چہل پہل تھی۔ یہاں ہر گلی میں بیوٹی پارلر موجود تھا۔کسی نے کہا یہاں کی خواتین صبح اٹھتے ہی پارلر کا رخ کرتی ہیں۔ میں نے سوچا اتنے زیادہ حسن کو بناؤ سنگار کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔فارسی کا محاورہ یاد آیا ''حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را''۔ یہ خواتین اپنے گھروں کو بھی بہت صاف ستھرا سجا کر رکھتی تھیں۔ان کی پسندیدہ شاپنگ خوبصورت بیڈ کورز اور تولیے تھے۔ باکو میں کوئی انڈسٹری نہیں تھیں۔ روس سے آزاد ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔مگر تیل اور معدنیات کی وجہ سے خوشحالی تھی۔اکثر پاکستانی تاجر وہاں تولیے اور بیڈ شیٹس کا کاروبار کر رہے تھے۔

ایک لڑکا، جو گلیوں میں پھر کر تولیے بیچتا تھا، نے بتایا کہ یہاں کی اکثر خواتین روزانہ نئے تولیے خریدتی ہیں اور پرانے پھینک دیتی ہیں۔

مجھے یہ بنی سنوری سجی سجائی خواتین بہت اچھی لگتی تھیں۔زبان نا جاننے کے باوجود یہ لوگ بہت دوستانہ مزاج رکھتے تھے۔ ملنے، بات کرنے کی کوشش کرتے۔

مہمان نوازی کر کے خوش ہوتے۔

نریمان نرماوو کے مجسّمے سے دن میں دو بار ضرور ملاقات ہو جاتی۔ کیونکہ اسی ٹرین اسٹیشن سے جانا ہوتا تھا۔ پلیٹ فارم کے راستوں پر دونوں طرف دکانیں تھیں جن میں بیگ، جینز، جیکٹس اور میک اپ کی اشیا کی دکانیں زیادہ تھیں۔ اسٹیشن سے باہر کچھ ریہڑیاں بھی دکھائی دیتیں تھیں۔ یہ ریہڑیوں والے پولیس والوں کو باقاعدہ بھتہ دیتے تھے۔ ورنہ ان کو وہاں سے اٹھا دیا جاتا۔ رشوت کے معاملہ میں باکو ائیر پورٹ کے حالات اور پولیس پاکستان سے مختلف نہیں تھی۔

اس اہم تجارتی مرکز کا نام جس ادیب کے نام سے منسوب تھا۔ اس کا پورا نام نریمان کربلائی نجف اوگلو نریمانو وتھا۔ وہ ڈرامہ نگار، کہانی کار اور ناول نگار تھا۔ نریمان نرماوو 14 اپریل 1870ء میں جارجیا میں پیدا ہوا۔ اور 19 مارچ 1925ء میں ماسکو میں وفات پائی۔ اس کی آخری رسومات بھی ماسکو میں ہی ادا کی گئیں۔

1922ء سے اپنی وفات تک وہ سوویت یونین کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کا چیئر مین رہا۔ اس کے والد آذربائیجان کے مڈل کلاس بزنس مین تھے۔

نریمان نرماوو نے نوعمری میں ہی 1905ء۔ 1907ء میں ناول لکھے۔ جن میں فرسودہ رسم و رواج، مذہبی پابندیوں اور توہمات کے خلاف آواز اٹھائی۔ نریمان نے ایک گاؤں کے سکول میں پڑھانا شروع کیا۔ اور کسانوں کی مشکلات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔

1902ء میں اس نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے۔ نوروزوسکی یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ 1908ء میں میڈیکل کی ڈگری حاصل کی۔

1905ء میں تعلیم کے دوران اس نے بالشویک پارٹی جوائن کی۔ اور طالب علم موومنٹ کا لیڈر رہا۔ اس کے بعد وہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے آرگنائزرز میں شامل

ہوا۔ان مشاغل کی وجہ سے 1909ء میں نریمان کو گرفتار کر کے پانچ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

اکتوبر 1917ء کے انقلاب کے بعد نریمان نرماوو آذربائیجانی سوشل ڈیمو کریٹک پولیٹیکل پارٹی کا صدر بنا۔

1920ء میں نرمان نرماوو کو آذربائیجانی انقلابی کمیٹی کا چیئرمین بنایا گیا۔اور ساتھ ہی اس کو چیئرمین آف پیپلز کمشنز آف آذربائیجانی سوویت ریپبلک کا عہدہ دیا گیا۔1922ء میں USSR نے اپنی پہلی کابینہ کے چار چیئرپرسنز میں سے ایک نامزد کیا۔

نریمان نرماوو نے بہت سے ڈرامے، کہانیاں اور ناول لکھے۔جن میں سب سے زیادہ مقبولیت اس کے ڈرامے ''بہادر اور سونا'' کو حاصل ہوئی۔(1896ء)

نریمان نے ''نادرشاہ'' کی داستان حیات بھی قلمبند کی۔(1899ء)

ان کی وفات ہارٹ اٹیک کے باعث 19 مارچ 1925ء میں ہوئی اس وقت ان کی عمر صرف 54 برس تھی۔

ان کے سوگواروں میں ان کی بیوہ کلثوم اور بیٹا نجف تھا۔جس نے 1938ء میں ریڈ آرمی جوائن کر لی تھی۔

1941ء میں آباد ہونے والے علاقے کیشلا کو 1957ء میں نریمان نریماوو کا نام دیا گیا۔یہاں کا ریلوے اسٹیشن۔گلیاں، بازار، پارک اور آذربائیجان کی میڈیکل یونیورسٹی بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔لنکران کے علاقے میں ایک ٹاؤن کو نریمان آباد کا نام دیا گیا ہے۔

بیلاروس میں ایک گاؤں اور ایک ہال ان کے نام سے منسوب ہے۔

جارجیا میں ایک سٹریٹ اور ایک میوزیم کا نام نریمان نریماوو ہے۔

کازغستان کے ایئرپورٹ کا نام ''نریمانو کا'' ہے۔
ترکمانستان میں ایک سٹریٹ کا نام نریمان نریمانو و کے نام پر ہے۔
یوکرائن کی ایک گلی اور ایک قصبہ ان کے نام سے منسوب ہے۔
ازبکستان کے ایک شہر کا نام ''نریمانوسکا'' ہے۔
تاشقند کا ایک علاقہ اور سینی ٹوریم ان کے نام پر ہے۔
ایک ناول نگار، کہانی کار اور ڈرامہ نگار کی بعد از مرگ اس طرح پذیرائی دیکھ کر بس یہ ہی خیال آتا ہے کہ یہ لوگ کتنے خوش نصیب تھے۔ آج بھی ہزاروں لوگ روزانہ ان کا نام پکارتے ہیں۔ اور ان کو مجسّموں کی صورت میں بھی سنبھال رکھا ہے۔

آتش گاہ......ایک دن زرتشت کے ساتھ

میں جہاں جاتی ہوں وہاں کی گلیوں بازاروں میں گھومنے نکل جاتی ہوں۔ پرانے شہروں کی پرانی گلیوں میں گزرے زمانے کے لوگوں کی خوشبو بسی ہوتی ہے۔

گھر سے نکل کر چند قدم ہی گئی تھی کہ ایک پراپرٹی ڈیلر کی دکان نظر آئی۔ اس میں دو لوگ بیٹھے کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ یہ شطرنج نما کوئی کھیل تھا۔ دونوں صحت مند نوجوان تھے مگر ان کے چار چار دانت سونے کے تھے۔ آذربائیجان کے اکثر لوگوں کے دانت جلدی خراب ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ سونے کے دانت لگوا لیتے ہیں۔ یہ لوگ چاکلیٹ اور میٹھا کھانے کے شوقین ہیں۔ سرد موسم کی وجہ سے دن بھر قہوہ پیتے رہتے ہیں، منہ میں چینی کی ڈلیاں رکھ کر۔ اس لیے ان کے دانت جلدی خراب ہو جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے منہ میں سونے کے دانت چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔

میں نے ان سے کرایہ پر گھر لینے کے بارے میں پوچھا۔ تو وہ مجھے ایک گھر دکھانے چل پڑے۔

یہ ایک خوبصورت فلیٹ تھا...... گراؤنڈ فلور پر...... اوپر والے فلیٹ میں مالک مکان رہتا تھا۔

ایک بیڈروم، لونگ، کچن، تمام فرنشڈ، ٹی وی، فریج، بہت خوبصورت اچھے رنگوں

کے بستر اور کمبل، کچن میں ڈائیننگ ٹیبل کے ساتھ شیلف میں ضرورت کے تمام برتن موجود تھے۔ آتشدان میں بڑا ہیٹر جل رہا تھا۔

فلیٹ کا کرایہ 200 ڈالر مہینہ تھا۔ ہم نے صرف پندرہ دن رہنا تھا۔ 2009ء اپریل میں پاکستانی کرنسی میں ایک ڈالر 60 روپے کا تھا۔ جبکہ آذر بائیجان کی کرنسی میں ایک منات 100 پاکستانی روپے کا تھا۔

میں نے کرایہ ادا کر کے چابی لی اور واپس آ گئی۔ میں اور میرا بیٹا رات کو ہی وہاں شفٹ ہو گئے۔

صبح مالک مکان جس کا نام حسینو تھا کی بیٹی ہمارے لیے ناشتہ لے کر آئی جو بہت لذیز آملیٹ جیسا تھا۔ کچن میں نمک، چینی اور قہوے کا سامان بھی موجود تھا۔

....

ناشتہ کرنے کے بعد ہم باکو کے قریبی قصبہ سرخانی کی طرف روانہ ہوئے۔ اس قصبے کی وجہ شہرت آتش گاہ ہے۔ جہاں سات سوراخوں سے آگ نکلتی رہتی ہے۔ سرخانی کی وجہ تسمیہ بھی یہ آتشیں سوراخ ہیں۔ ایک روایت کے مطابق سرخانی کا نام سرخ رنگ سے لیا گیا ہے۔ سرخ رنگ کو بھی آتش کا رنگ کہتے ہیں۔

یہاں ایک قدیم عبادت گاہ ہے۔ سترہ یا اٹھارہ صدی میں جب ہندو سمندر اور شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی شاہراہ گرینڈ ٹرنک روڈ کے ذریعے کاروبار کے سلسلے میں یہاں پہنچے تو انہوں نے ان آتشیں سوراخوں کے گرد عمارت تعمیر کروائی۔ اس آتشگاہ کو پارسی، ہندو اور سکھوں کی عبادت گاہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پتھریلی دیواروں پر کچھ عبارتیں بھی درج ہیں۔

14 عبارتیں سنسکرت میں ہیں...... دو پنجابی گورمکھی میں...... اور ایک عبارت فارسی میں ہے۔

سنسکرت میں لکھی عبارت میں ہندو دیوتا شیو جی کا ذکر ہے جو برہما، وشنو اور شیوا۔ تین بڑی طاقتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ شیوا کے چار ہاتھ اور تین آنکھیں ہیں۔ وہ شیر کی کھال کا لباس پہنتے اور گلے میں سانپ کی مالا پہنتے ہیں۔ ان کی سواری گائے ہے جس کا نام نندی ہے۔ بھارت ناٹیم ان کا رقص ہے۔ ان کو بہت سے ناموں سے پکارا جاتا ہے، بھولے ناتھ، شنکر، چندر شیکھر، گنگا دھر۔ ان کے بیٹے گنیش کا بھی ذکر ہے۔

گنیش کو گھر کا رکھوالا مانا جاتا ہے۔ اس لیے ہر گھر کے بیرونی دروازے کے پاس گنیش کی مورتی ہوتی ہے۔

روایت یہ ہے کہ شیوا کی بیوی پاروتی گھر میں اکیلی تھی۔ اس نے ایک مورتی بنائی اور اس میں روح ڈالی۔ وہ ایک پیارا سا بچہ بن گیا۔ پاروتی نے اس بچے کو اپنا بیٹا بنالیا۔ اور اس کو کہا میں نہانے جارہی ہوں کوئی بھی آئے اس کو گھر کے اندر نہیں آنے دینا۔ گنیش گھر کی سیڑھیوں پر پہرہ دینے لگے۔

شیوآئے تو گنیش نے انہیں گھر کے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ شیو نے غصے میں گنیش کا سر قلم کر دیا۔

پاروتی باہر آئی تو اپنے بیٹے کو دیکھ کر رونے لگی۔ شیو سے کہا میرا بیٹا زندہ کر کے دو۔ شیوا نے اپنے ملازموں سے کہا کہ اس کا سر ڈھونڈ کر لائیں۔ لیکن وہ سر نہ ملا۔ پھر حکم دیا کہ جو بھی سویا ہوا ملے اس کا سر لے آؤ۔ کارندوں کو ایک ہاتھی کا بچہ سویا ملا۔ وہ اس کا سر کاٹ کر لے آئے۔ جس کو گنیش کے جسم سے لگایا تو اس میں دوبارہ جان آگئی۔ سنسکرت کی عبارت میں درج ہے۔

یہ دنیا چار پاک عناصر سے بنی ہے۔
آگ، پانی، ہوا اور مٹی

مجھے یاد آیا میرے ڈیڈی اکثر ایک شعر گنگنایا کرتے تھے

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب

موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

سرخانی میں 1883ء میں پٹرول کے پلانٹ لگائے گئے۔ اور 1975ء میں اس مندر کو عجائب گھر میں تبدیل کیا گیا۔

ممبئی سے یہاں پارسی مذہبی پیشوا بھی آتے رہے ہیں۔ پارسی لوگوں کو آتش پرست بھی کہا جاتا ہے۔ جو 600 قبل مسیح میں پیدا ہونے والے پیمبر زرتشت کے پیروکار ہیں۔ زرتشت آذربائیجان کے علاقے گنجہ میں پیدا ہوئے اس کے بعد ایران کے علاقے خراسان چلے گئے۔ اس لیے انہیں ایران کا پیمبر بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے خیر اور شر کا نظریہ پیش کیا۔ یزداں ...... یا اہورامزدا...... خیر اور اہرمن شر کی علامت ہے۔

ان پر کچھ صحیفے بھی نازل ہوتے رہے۔ جنہیں ''زنداوستا'' کہا جاتا ہے۔

جو فرشتہ ان پر وحی لے کر آتا تھا، اس کا نام سروش تھا۔

اس مذہب کو ایرانی بادشاہ کورش اعظم جس کو سائرس دی گریٹ بھی کہا جاتا ہے، کے زمانے میں فروغ ملا۔ اس کو ذوالقرنین بھی کہا جاتا ہے۔ دارا بھی اسی مذہب کا پیروکار تھا۔

اس مذہب کے پیروکار تبلیغ نہیں کرتے۔ نا ہی کسی کو اپنے مذہب اور عبادت گاہوں تک رسائی دیتے ہیں۔ شادیاں بھی آپس میں کرتے ہیں۔ اس لیے اب ان کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح نے ایک پارسی لڑکی رتی کو مسلمان کر کے شادی کی تھی۔ جس سے محمد علی جناح کی واحد اولاد دینا جناح پیدا ہوئی۔ دینا کی پرورش اس

کے ننھیال میں ہوئی اس کی شادی بھی اسی خاندان میں ہوئی۔ وہ دیناواڈیا کہلائیں۔ کچھ عرصہ پہلے ان کا ممبئی میں 98 برس کی عمر میں انتقال ہوا ہے۔

زرتشت سے محبت اور خیر وشر کے فلسفے سے دلچسپی بھی زمانہ طالب علمی میں شروع ہوئی تھی۔ جب پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبہ فارسی میں داخلہ لیا تھا۔ اور تاریخ ایران پڑھی تھی۔

زرتشت کا زمانہ 600 قبل مسیح سے 500 قبل مسیح تک ہے۔ اور غالباً یہ ان ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں شامل ہیں۔ جن کے نام قران مجید میں درج نہیں ہوئے۔

میں اس عمارت کے مختلف حصوں میں گھومتے۔ صدیوں سے روشن آگ کی مشعلوں کو دیکھتے ہوئے۔ زرتشت کو ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر وہ کہیں نہیں تھے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ شاید اس لیے ان کے پیروکار بھی لوگوں سے زیادہ رابطہ نہیں رکھتے۔ ایک پراسراری اجنبیت برقرار رکھتے ہیں۔ یہ پراسراریت اس عمارت کے درودیوار سے جھانک رہی تھی۔

اسی وقت ایک دیوار پر میری نظر پڑی جہاں زرتشت کی تعلیمات کا نچوڑ۔ دنیا کے سب انسانوں کے لیے ان کا پیغام درج تھا۔

"گفتار نیک، پندار نیک، کردار نیک"

''فضولی'' سے ملاقات

میں زیتون کے درختوں کی چھاؤں میں چل رہی تھی۔ اور تازہ کالے زیتون میرے پیروں تلے آ کر زمین کو سیاہ کر رہے تھے۔ زمین پر بچھے زیتون اتنی تعداد میں تھے کہ ان سے بچ کر چلنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ کچلے جا رہے تھے اور میں اک احساس زیاں کے ساتھ چلتی جا رہی تھی۔ میرے آگے جینز کے ساتھ اونچی ایڑی والے جوتے پہنے دو نوعمر لڑکیاں کمر لچکاتی چل رہی تھیں۔ ان کے گھنے سیاہ بالوں کی چوٹیاں ان کے ٹخنوں کو چھو رہی تھیں۔ بچپن میں پریوں کے دیس کوہ قاف کی بہت کہانیاں سن رکھی تھیں۔ مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کوہ قاف اسی دنیا میں ہے۔ اور پریاں اور پری زاد بھی موجود ہیں۔ کوہ قفقاز، آذربائیجان کا ایک پہاڑ ہے۔ جو پریوں کی داستانوں میں شامل ہوتا ہے۔

یہاں کے لوگ سرخ و سفید ہونے کے ساتھ دلکش نقوش کے بھی مالک ہیں۔ اکثر لوگوں نے فیشن کے طور پر سونے کے دانت لگوا رکھے تھے۔ گویا ان کی مسکراہٹ بھی سنہری تھی۔ سونے کے دانتوں کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ چاکلیٹ اور میٹھے کے شوقین ہیں۔ سارا دن قہوہ پیتے ہوئے چینی کی ڈلیاں منہ میں رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے دانت جلدی خراب ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ سونے کے دانت لگوا لیتے ہیں۔

مسلمان ملک ہونے کے باوجود یہاں پردے کا رواج نہیں ہے۔عورتیں انگریزی لباس پہنتی ہیں اور بیوٹی پارلرز میں جا کر بناؤ سنگھار کرتی ہیں۔دفاتر، دکانوں ہر جگہ خواتین کام کرتی نظر آتی ہیں۔

میں نے فضولی سے ملنے جانا تھا۔محمد بن سلیمان فضولی پندرہویں اور سولہویں صدی کے دوران آذربائیجان کا اہم ترین شاعر تھا۔وہ 1494ء میں کربلا میں پیدا ہوا۔1556ء میں کربلا میں وفات پائی۔اس نے تین زبانوں میں شاعری کی۔فارسی،عربی اور آذربائیجانی۔صرف بارہ سال کی عمر میں فضولی نے مثنوی ''بنگ و بادہ'' لکھی۔جس میں اس نے سلطان بازید دوم کو ''چرس'' اور صفوی شاہ اسماعیل کو ''شراب'' سے تشبیہ دی۔

فضولی تخلص رکھنے سے پہلے محمد بن سلیمان نے کئی تخلص رکھے۔لیکن وہ سب کسی نا کسی ہم عصر شاعر نے رکھ لیے۔تنگ آ کر اس نے اپنا تخلص عربی لفظ فضول سے فضولی رکھا۔جس کا مطلب ''غیر ضروری'' تھا۔اس کو یقین تھا کہ یہ تخلص کوئی نہیں چرائے گا۔

فضولی کی مثبت سوچ نے اس کا مطلب فضل سے فضولی نکالا۔جیسے علم سے علوم۔فن سے فنون اسی طرح فضل سے فضول کا معنی لیا۔

فضولی کی زندگی کا زیادہ وقت مولائے کائنات حضرت علی کے روضہ مبارک پر نجف اشرف میں گزرا۔

فضولی کی شاعری میں صوفی نظریہ وحدت الوجود کا بیان نمایاں ہے۔ان کی سب سے مشہور تصنیف ''داستان لیلیٰ مجنوں'' ہے۔

میں نریمان نرماو ٹرین اسٹیشن سے فضولی کے لیے روانہ ہوئی۔

فضولی ٹرین اسٹیشن پر فضولی کی پینٹنگز نے ہمارا استقبال کیا۔

اسٹیشن سے نکلتے ہی چوراہے میں فضولی ایک بہت بڑی کرسی پر براجمان نظر

آئے۔ میں ان کے پاس جا کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

علم اور عالم کی تعظیم کرنا ہمیں بچپن سے سکھایا گیا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں، میں روزانہ ''وولنر'' کے مجسمے کو سلام کرتی تھی۔ جو کتاب لے کر آج بھی پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے باہر نصب ہے۔ یہ واحد مجسمہ تھا جسے لاہور کے دیگر مجسمے ہٹاتے ہوئے۔ رہنے دیا گیا تھا۔

فضولی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''کیسے آئی ہو بیٹی؟'' وہ مجھ سے مخاطب تھے۔

علم کی پیاس ہے بابا۔ جو آپ تک لے آئی ہے۔

''باب علم کے پاس جاؤ''۔

''یہ فضل صرف وہاں سے ملتا ہے۔''

''آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے۔''

''کیا پوچھنا چاہتی ہو''۔

''آپ نے داستان لیلیٰ مجنوں کیوں لکھی؟''۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ میں نے سمجھا وہ جواب نہیں دینا چاہتے۔

میں نے پھر کہا۔ صرف عشق کی کہانیوں کو ہی دوام کیوں ہے۔؟ نظامی گنجوی نے خسرو شیریں، وارث شاہ نے ہیر رانجھا، میاں محمد بخش نے سیف الملوک، شیکسپیئر نے رومیو جولیٹ لکھ کر دوام حاصل کیا۔ امیر خسرو نے نظام الدین اولیاء، مولانا روم نے شمس تبریزؒ، بلھے شاہؒ نے شاہ عنایتؒ کے عشق میں ڈوب کر شاعری کی اور امر ہو گئے۔

فضولی کے چہرے پر پراسراری مسکراہٹ پھیل گئی۔ سورج کی کرنوں نے رخ بدلا تو ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی۔

''عشق حق ہے...... حق عشق ہے...... جس دن تمہیں اس بات کی سمجھ آ گئی تمہاری شاعری کو بھی دوام مل جائے گا''۔

یہ کہہ کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ میں ایک نئی سرشاری کی کیفیت لیے وہاں سے واپس آئی۔ میرے بیٹے نے بتایا۔ باکو کے اس علاقے کا نام ہی فضولی کے نام پر نہیں ہے۔ بلکہ 1959ء میں ایک قصبہ کو فضولی نام دیا گیا ہے۔

آذربائیجان کے بنک نے 1996ء میں ان کے نام کے دو سکے جاری کیے۔ 100 منات کا سکہ سونے کا جبکہ 50 منات کا سکہ چاندی کا تھا۔ یہ حکومت کا محمد بن سلیمان فضولی کو ان کی 500ویں۔ یوم ولادت پر خراج تحسین تھا۔

حضرت بی بی ہیبت اور شاعرہ خورشید بانو ناتواں

ساحل: باکو کے ساتھ رواں دواں طویل سمندر کے علاقے کا نام ساحل ہے۔ یہ کیسپین سمندر ہے۔ جو ایشیا اور یورپ کے درمیان بہتا ہے۔ اس سمندر کے کنارے ایران، روس، آذربائیجان، قازقستان اور ترکمانستان کے مختلف شہر آباد ہیں۔ ان شہروں میں باکو سب سے بڑا شہر ہے۔ جو آذربائیجان کا دارالخلافہ بھی ہے۔ اس سمندر کو فارسی میں ''دریائے خزر'' کہتے ہیں۔

ساحل کی طرف جانے کے لیے ٹرین پر سوار ہوئے تو کچھ پاکستانی لڑکے بیٹھے دکھائی دیئے۔ ان کے ساتھ ایک 40 یا 45 سالہ شخص بھی تھا۔ یہ لڑکے جو حلیہ سے دیہاتی لگ رہے تھے۔ کچھ سہمے سے تھے۔ ان کو نیا ماحول، اجنبی زبان اور ملک نے ہراساں کر رکھا تھا۔ مجھے راستے میں کسی نے بتایا تھا کہ مختلف ایجنٹ لوگوں کو یورپ کا جھانسا دے کر یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ روزی کی تلاش میں اپنے زیور، گھر یا زمین بیچ کر ایجنٹوں کے ہاتھوں یہاں پہنچتے ہیں۔ زبان نا جاننے کی وجہ سے کوئی کام بھی نہیں کر سکتے۔ ویزہ ختم ہونے پر ان سے بھاری جرمانے وصول کر کے ان کو پاکستان واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ یوں اچھے مستقبل کا خواب دیکھنے والے اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں اپنی جمع پونجی لٹا کر واپس آ جاتے ہیں۔

ان کی حالت زار پر افسوس ہو رہا تھا کہ ہمارا اسٹیشن ساحل آ گیا اور ہم ٹرین سے اتر کر ہرے بھرے باغ میں سے گزرتے ہوئے ساحل سمندر کی طرف چل پڑے۔

اس ساحل کے کنارے۔بی بی ہیبت کا روضہ مبارک ہے۔

بی بی ہیبت۔اثنا عشری عقیدہ کے مطابق۔ساتویں امام حضرت امام موسی کاظم کی بیٹی ہیں۔آٹھویں امام حضرت علی بن موسی الرضا کی ہمشیرہ ہیں۔

چھٹے امام حضرت جعفر صادق کی پوتی ہیں۔

ایک روایت کے مطابق امام موسی کاظم کے 37 بچے تھے۔

جن میں چار بیٹیاں تھیں۔سب کا نام فاطمہ رکھا گیا۔

بڑی بیٹی فاطمہ کبری ایران کے شہر قم میں رہیں اور وہیں ان کا روضہ مبارک ہے۔وہ معصومہ قم کے نام سے جانی جاتی ہیں۔

بی بی ہیبت کا نام فاطمہ صغرا تھا اور لقب حکیمہ خانم۔انہوں نے عباسی خلفا کے ظلم وستم سے تنگ آ کر آذربائیجان میں پناہ لی۔ان کے ساتھ ان کے تین بھانجے بھی تھے۔سب ان کو ان کے بھانجوں کی نسبت سے بی بی ہیبت پکارنے لگے۔بی بی خالہ کو کہا جاتا ہے۔اب ان کا روضہ مبارک بی بی ہیبت کا روضہ کہلاتا ہے۔

یہ روضہ تیرہویں صدی میں شیروان شاہ فرخ زاد نے بنوایا تھا۔روسی دور حکومت میں بالشویک نے اسے مکمل طور پر مسمار کر دیا۔اس روضہ کا نقشہ تیرھویں صدی کے مشہور آرکیٹکٹ محمد بن اسد نے ڈیزائن کیا تھا جس نے باکو کے قریب۔ناردا ران قلعہ بھی تعمیر کیا تھا۔

1990 میں بی بی ہیبت کا روضہ اور مسجد دوبارہ تعمیر کی گئی۔

1994 میں آذربائیجان کی آزادی کے بعد پہلے صدر حیدر علی وو نے اس مسجد کو دوبارہ بنانے کا حکم دیا۔پرانی تصاویر کی مدد سے اس کی پرانی شکل وصورت برقرار کی

گئی۔اس تعمیر کو تکمیل کے بعد 2008 میں عوام کے لیے کھولا گیا۔

1840 میں فرانس کے ایک مورخ الیگزنڈر دماس نے آذر بائیجان کا سفر کیا۔ اس نے اپنی کتاب میں روضہ جناب بی بی ہیبت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس جگہ جو بے اولاد عورت ننگے پاؤں آ کر دعا مانگتی ہے۔اللہ کے کرم سے اسی سال وہ اولاد کی نعمت پالیتی ہے''۔

آذر بائیجان کی مشہور شاعرہ خورشید بانو ناتواں جس کا شمار آذر بائیجان کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔وہ فارسی اور آذری میں شاعری کرتی تھیں۔کر باغ کے حکمران مہدی قلی خان کی بیٹی تھیں۔اپنے خاندان کی واحد وارث ہونے کی وجہ سے والد کی وفات کے بعد کر باغ کی حکمران بنیں۔انہوں نے کر باغ کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے کام کیے۔

شوشا شہر جہاں وہ پیدا ہوئی تھیں میں ایک نہر جاری کروائی۔اسی شہر میں پانی کا ایک چشمہ بنوایا جو اب عالمی ورثہ کی حیثیت رکھتا ہے۔خورشید بانو ناتواں نے گھوڑوں کا اصطبل بنوایا۔جہاں اچھی نسل کے گھوڑوں کی پرورش کی جاتی تھی۔1869 میں اس کے ایک گھوڑے نے پیرس میں سلور میڈل۔ایک نے برونز میڈل اور تیسرے نے سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

روس کی نمائش میں بھی اس کے گھوڑے مامون نے سلور میڈل حاصل کیا۔

خورشید بانو فارسی اور آذری میں شاعری کرتی تھیں۔ان کی شاعری کے موضوعات انسانیت، دوستی پیار اور محبت تھے۔ان کی رومانی غزلوں میں عورتوں کے جذبات اور مسائل کی نشاندہی ہوتی تھی۔کیونکہ وہ خود بھی بے اولادی کے کرب سے گزری تھیں۔

اپنے وقت کی حکمران طاقت ور خاتون نے اپنا تخلص ''ناتواں'' رکھا تھا۔

اس نے حصول اولاد کی دعا مانگنے کے لیے پیدل بی بی ہیبت کے روضہ مبارک کی طرف سفر کیا اور منت مانی کہ بچہ پیدا ہونے پر اس روضہ مبارک تک آنے والی سڑک کو تعمیر کرواوں گی۔

اللہ نے ان کو دو بیٹوں سے نوازا۔ مہدی گلو خان وفا اور میر حسن خان آغا میر۔ یہ دونوں صاحب دیوان شاعر ہوئے ہیں۔ منت کی تکمیل کے لیے روضہ مبارک تک پختہ سڑک تعمیر کروائی گئی۔

1897 میں خورشید بانو ناتواں نے وفات پائی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ عوام نے اس کو 30 کلومیٹر تک کندھا دیا۔ ان کی تدفین شوشا میں ان کے آبائی قبرستان میں ہوئی۔ ان کے اشعار لوک گیتوں کا روپ دھار کر لوگوں کے دلوں میں بس گئے ہیں۔

ہم روضہ بی بی ہیبت کے وسیع وعریض صحن میں کھڑے تھے۔ اپریل کی سرد تیز ہوا ہیں سمندر کی طرف دھکیل رہی تھی۔ باکو طوفانی ہواؤں کا شہر ہے۔ جو اس قدر شدید ہوتی ہیں کہ سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بہت مشکل سے ہوا کے تھپیڑے سہتے ہوئے عمارت میں داخل ہوئے۔ وہاں پہلی نظر جس عبارت پر پڑی، وہ تھی ...... سلام یا حسین!

نظامی گنجوی اور نیشنل میوزیم فار لٹریچر

نظامی گنجوی آذربائیجان کا سب سے اہم شاعر ہے۔ اس کے نام سے باکو کا سب سے خوبصورت مہنگا اور بڑا علاقہ منسوب ہے۔ آذربائیجان کے نیشنل میوزیم فار لٹریچر کا نام بھی نظامی گنجوی کے نام پر ہے۔

ہم نرمان نرماوو اسٹیشن پر ٹکٹ خریدنے کے لیے لائن میں کھڑے تھے۔ ایک شخص جو اسٹیشن سے باہر آرہا تھا۔ اس نے اپنا ٹرین ٹکٹ ہمیں دے دیا۔ ہم حیران تھے کہ اس نے کہا "یہ سارے دن کا ٹکٹ ہے۔ میں نے اب سفر نہیں کرنا۔ آپ استعمال کر سکتے ہیں"۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آنے والی ٹرین پر سوار ہو گئے۔

نظامی ٹرین اسٹیشن بہت خوبصورت تھا۔ ہر دیوار پر نظامی گنجوی کی بڑی بڑی تصاویر پینٹنگز کی صورت میں منقش تھیں۔

اسٹیشن سے باہر نکلے تو 9 میٹر اونچے چبوترے پر نظامی کا 6 میٹر اونچا مجسمہ دکھائی دیا۔ جس کو دیکھ کر ہمیں بھی اپنا سر فخر سے بلند ہوتا محسوس ہوا۔ کیونکہ ہمارا بھی قلم سے کچھ نا کچھ رشتہ تو ہے۔ اس مجسمہ کو 1949ء میں مشہور مجسمہ ساز فواد عبدالرحمن نے تعمیر کیا تھا۔

جمال الدین ابو محمد الیاس ابن یوسف ابن ذکی کا تخلص نظامی گنجوی ہے۔

آذربائیجان کے علاقے گنجہ میں 1141ء میں پیدا ہوئے۔ اور گنجہ ہی میں وفات پائی۔ یہ بارہویں صدی کے اہم ترین فارسی شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔

آذربائیجان دنیا بھر میں شیعہ عقائد رکھنے والے مسلمانوں کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ پہلے نمبر پر ایران ہے۔ نظامی گنجوی سنی العقیدہ تھے۔ ان کو افغانستان۔ ایران، آذربائیجان، کردستان اور تاجکستان میں اہم شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔

ان کا اپنا نام الیاس اور تخلص نظامی تھا۔ ان کی والدہ کا نام رئیسہ تھا اور وہ کرد تھیں۔ والد کا نام یوسف تھا۔ دادا کا نام ذکی تھا۔ دادا کا تعلق قم سے تھا۔ نظامی بچپن میں یتیم ہو گئے۔ ان کی پرورش ان کے چچا خواجہ عمر نے کی اور تعلیم دلوائی۔

نظامی کی پہلی شادی آفاق نامی کنیز سے ہوئی۔ جس کو دار بند کے حکمران فخر الدین بہرام شاہ نے انہیں تحفہ کے طور پر بھجوایا تھا۔ گنجوی کو اپنی اس بیوی سے بہت محبت تھی۔ ان کی واحد اولاد محمد بھی اسی بیوی کے بطن سے پیدا ہوا۔ جب مثنوی ''خسرو شیریں'' مکمل ہوئی تو وہ وفات پا گئیں۔ اس وقت محمد کی عمر صرف 7 سال کی تھی۔ نظامی گنجوی نے دوبارہ شادی کر لی۔ مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' مکمل ہوئی تو دوسری بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس مثنوی میں محمد کے بارے میں لکھا ہے کہ ''محمد چودہ برس کا ہو چکا ہے اور وہ میرے دل کا چین ہے''۔

نظامی نے ایک بار پھر شادی کی۔ اور مثنوی ''ہفت پیکر'' لکھنا شروع کی۔ اس میں اپنے بیٹے کو کچھ نصیحتیں بھی کیں۔

''ہفت پیکر'' کی تکمیل کے بعد ان کی تیسری بیوی بھی وفات پا گئی۔ جس پر نظامی نے کہا ''اے خدا کیا میری ہر مثنوی پر میری ایک بیوی کی قربانی لینی ہے''

نظامی گنجوی شاعری میں فردوسی کو اپنا استاد مانتا تھا۔ اس نے فردوسی کو حکیم اور دانائے عظیم کہا ہے۔ شاہنامہ فردوسی اس کی پسندیدہ ترین کتاب تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ

فردوسی نے شاہنامہ میں الفاظ کو نئی نویلی دلہن کی طرح سجایا ہے۔ نظامی نے شیروان کے بیٹے کو شاہنامہ پڑھنے کی نصیحت بھی کی۔

نظامی درباری شاعر نہیں تھا وہ ساری زندگی دربار اور مجالس سے دور رہا۔ اور اپنا وقت مطالعہ اور لکھنے میں صرف کرتا رہا۔

نظامی نے اپنی تین مثنویاں ''ہفت پیکر''، ''خسرو شیریں'' اور ''سکندر نامہ'' کو شاہنامہ فردوسی سے متاثر ہو کر لکھا۔ جبکہ نظامی نے اپنی پہلی کتاب ''مخزن الاسرار'' ثنائی کی ''حقیقت الحقیقہ'' سے متاثر ہو کر لکھی۔ ''سکندر نامہ'' سکندر اعظم کی زندگی کے تین ادوار پر مشتمل ہے۔

1۔ فاتح اعظم 2۔ علم و دانش کی تلاش 3۔ پیغمبر سکندر بطور سیاح

سکندر اعظم کے احوال میں درج ہے کہ روم، مصر، ایران، ہندوستان، چین اور روس فتح کرنے کے بعد سکندر اعظم نے مکہ کا سفر بھی کیا۔

اس دیو ہیکل مجسمہ کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ تھیں۔ ذہن و دل حیرت اور خوشی کے جذبات سے معمور تھے۔ ہم نے نظامی کو سلام عقیدت کا نذرانہ پیش کیا۔ اچھری بازار کے قریب واقع نظامی نیشنل میوزیم فار لٹریچر دیکھنے چلے گئے۔ یہ عجائب گھر ایک خوبصورت سجی سجائی لائبریری کی طرح تھا جس کی بیرونی دیوار پر مختلف ادور کے شاعروں اور ادیبوں کی تصاویر رنگین پینٹنگز کی صورت میں مزین تھیں۔

رفتم بہ مسجد تا بینم جمال دوست

دست بہ رخ کشیدہ دعا را بہانہ ساز

(نظامی گنجوی)

اچھری شہر...... پرانا باکو

باکو کے وسط میں پرانے شہر کے آثار ہیں۔ جنہیں یونیسکو نے ورلڈ ہیریٹیج قرار دیا ہے۔ یہاں شیروان شاہ کا محل، قلعہ اور مسجد کے مینار ہیں۔ ان جگہوں کو دیکھنے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں لگائی گئی۔ جو لوگ اپنی گاڑی پر آئیں ان کو پارکنگ فیس دینی پڑتی ہے۔ تنگ گلیوں میں پتھروں سے بنے فرش ہیں۔ محل ایرانی آرکیٹیکچر کا شہکار ہے۔ اس جگہ بہت سے ریسٹورنٹ بھی موجود ہیں اور پرانی ثقافتی اشیاء کی دکانیں بھی ہیں۔ پرانی طرز کے کنوئیں بھی موجود ہیں۔

بہت سارے قدیم مقامات کو دیکھتے ہوئے مجھے لاہور کا شاہی قلعہ، جہانگیر کا مقبرہ، نور جہاں اور آصف جاہ کے مقابر، کامران کی بارہ دری یاد آتی ہے۔

سویڈن کے سٹاک ہوم کے پرانے شہر کو دیکھتے ہوئے لاہور کا والڈ سٹی یاد آیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ ہم اپنے ورثہ کی قدر نہیں کرتے۔ ہم نے ان جگہوں کو کبھی اہمیت نہیں دی۔

ایک بار میں اپنی انڈین دوست رشمی کو مقبرہ جہانگیر دکھانے گئی۔

اس نے دیکھتے ہی کہا ''یہ تو بالکل تاج محل جیسا ہے۔ بس وہ سفید پتھر کا ہے اور یہ سرخ پتھر کا''۔

مجھے اس کی بات میں صداقت نظر آئی۔لیکن کیا ہم مقبرہ جہانگیر کو دنیا بھر میں وہ مقام دلا سکے ہیں۔ جو تاج محل کا ہے۔ہم تو اس میں مقامی سیاحوں کے لیے کوئی دلچسپی پیدا نہیں کر سکے۔ بین الاقوامی سیاحوں کو کیسے متحرک کرتے۔ پاکستان میں بین الاقوامی سیاحوں کے لیے اتنے زیادہ مقامات ہیں جو شاید کسی اور ملک میں ہوں۔ لیکن اس شعبہ کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا۔

مختلف مذاہب کے پرانے آثار یہاں موجود ہیں۔جن کی پروموشن سے دنیا بھر سے ان مذاہب کے پیروکار پاکستان کا رخ کر سکتے ہیں۔جن کی آمدورفت سے نا صرف ملک کے زرمبادلہ میں اضافہ ہوگا۔ بلکہ مقامی اشیا کی فروخت میں بھی بہتری آئے گی۔

محکمہ سیاحت برسوں سے موجود ہے۔مگر دیگر سرکاری اداروں کی طرح اس کی کارکردگی بھی قابل ذکر نہیں رہی۔

ہم نے تو شہر کی خوبصورتی اور پہچان دریائے راوی کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا۔

سکھ مذہب کے بانی گورو بابا نانک کا جنم استھان، سکھوں کے پانچویں گورو ارجن دیو.جی کی جائے شہادت۔

ہندو مذہب کے پیروکاروں کے لیے کٹاس راج۔ جہاں شیوا جی کا ایک آنسو تالاب کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ایک روایت کے مطابق پاروتی کی موت پر شیو.جی کی آنکھوں سے دو آنسو بہے تھے۔جن میں سے ایک کٹاس راج اور دوسرا اجمیر شریف میں گرا تھا۔ان دونوں جگہوں پر وہ آنسو تالاب کی صورت میں موجود ہیں۔

جین مت کے پیروکاروں کے مندر۔

مہاتما بدھ کی تہذیب ٹیکسلا اور گندھارا۔

وادی کیلاش میں کیلاشی مذہب کے پیروکاروں کے گاؤں۔

اور سندھ میں پارسی مذہب کی عبادت گاہیں۔

جو کہ اب بہت کم رہ گئی ہیں۔ پارسیوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے کیونکہ وہ تبلیغ نہیں کرتے۔ اور کسی کو اپنے قبیلے میں شامل نہیں ہونے دیتے۔ اس لیے ان کی آبادی اب ممبئی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ سارا دن پرانا شہر دیکھتے اور اپنے دیس کی مختلف جگہوں کو یاد کرتے گزر گیا۔

آج ہمارا باکو میں آخری دن تھا۔ شام کو گھر پہنچے تو گھر کے راستے میں ایک خوبصورت خیمہ لگا تھا۔ جس کے اندر باوردی ویٹر کرسیوں پر بیٹھے لوگوں کو قہوہ پیش کر رہے تھے۔ ہم نے سمجھا کوئی تقریب ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس گھر میں کسی کی وفات ہوئی ہے۔ اور یہ لوگ تعزیت کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ میت کو ہسپتال سے مسجد میں منتقل کیا جاتا ہے وہاں اس کو غسل اور کفن دیا جاتا ہے۔ وقت مقرر پر احباب اور رشتہ دار مسجد میں جا کر نماز جنازہ ادا کرتے ہیں۔ اور پھر تدفین کے لیے قبرستان لے جاتے ہیں۔ یہ سن کر دل بہت پریشان ہوا۔

رات کو میرے بیٹے کو ایک پاکستانی کا فون آیا۔ وہ لوگ نائٹ کلب جا رہے تھے۔ بیٹے نے کہا آپ بھی ساتھ چلیں۔ جاتے جاتے یہاں کا نائٹ کلب بھی دیکھ لیتے ہیں۔

ٹیکسی لے کر نائٹ کلب پہنچے۔ ہفتہ کی رات تھی۔ کافی زیادہ رش تھا۔ کچھ پاکستانی بھی تھے۔ ڈانسنگ فلور پر نوجوان آذری لڑکے لڑکیاں محو رقص تھیں۔

نائٹ کلب کا مینیجر جو ایک نوجوان آذری تھا۔ وہ ہمارے پاس آیا۔ اور اس نے بڑے مؤدب انداز میں کہا۔ ہم یہاں کافی سرو نہیں کرتے۔ لیکن میں نے خاص طور پر آپ کے لیے کافی بنوائی ہے۔ یہ اخلاق اور روایات خواتین کا احترام بزرگوں کا

احترام اور بچوں کا احترام جو میں نے آذر بائیجان میں دیکھا۔ دنیا کے اور کسی خطے میں دکھائی نہیں دیا۔

واپس گھر کے لیے نکلے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ ٹرین اور بسوں کے اوقات ختم ہو چکے تھے۔ کوئی ٹیکسی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ لہٰذا پیدل چل پڑے۔ تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ ایک ٹیکسی قریب آ کر رکی۔ جس میں ایک سواری بھی موجود تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا ''آپ نے کہاں جانا ہے؟''

ہم نے کہا۔ ''نریمان نرماوو''

اس نے کہا ''آپ بیٹھ جائیں میں آپ کو اتار دوں گا۔ اس وقت آپ کو کوئی سواری نہیں ملے گی''۔

ہم اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اس نے پہلے سے بیٹھی سواری سے اجازت لی کہ وہ پہلے ہمیں اتار دے۔ جس پر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد ہم اپنے گھر پہنچ چکے تھے۔ نیند اب بھی آنکھوں سے دور تھی۔ صبح سویرے واپسی کا سفر شروع ہونا تھا۔ اپنا اپنا سامان پیک کیا اور دن بھر کی قضا نمازیں پڑھیں۔ آنکھ لگی ہی تھی کہ فجر کی اذان ہو گئی۔

الوداع! فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں کی سرزمین

صبح سویرے مالک مکان کی بیٹی ہمارے لیے ناشتہ لے کر آئی۔ اس کی سرخ آنکھوں سے لگ رہا تھا۔ رات بھر سوئی نہیں۔ چہرے پر اداسی تھی۔ میں نے ایک کڑھائی والی شال اس کو دی تو اس کے گلابی گالوں کے گڑھے گہرے ہو گئے۔

ہم نے ناشتہ کیا۔ آذربائیجانی قہوہ پیا۔ اور ایئر پورٹ کی طرف جانے کے لیے گھر سے نکل پڑے۔

محلے کی ایک لڑکی سامنے والے گھر سے نکلی۔ جس کو ہم دیکھ کر گزر جاتے تھے۔ مگر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ لوگوں سے میل جول میں آذری زبان بھی حائل تھی۔ یہاں کے لوگوں کی اکثریت ترکی، آذری، اور روسی جانتے تھے۔ انگریزی نہیں۔ اس لڑکی نے میرے بیٹے کو ایک کاغذ پکڑایا اور واپس بھاگ کر اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔ بیٹے نے کاغذ دیکھ کر مجھے پکڑا دیا۔ اس پر شکستہ خط میں لکھا تھا۔

I MISS YOU

میں نے سوچا یہ مشرقی لڑکیاں بھی کتنی بیوقوف ہوتی ہیں۔ بغیر جانے پہچانے پردیسیوں سے دل لگا لیتی ہیں۔

ایک پرانی فلم کا گیت یاد آ گیا

پردیسیوں سے نہ اکھیاں ملانا
پردیسیوں کو ہے اک دن جانا

مجھے خیال آیا ان سارے دنوں میں میں نے کوئی شاپنگ نہیں کی تھی۔ دیکھنے کو اتنا کچھ تھا۔ کہ بازاروں میں جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بہرحال اب گزرتے ہوئے۔ ریلوے اسٹیشن سے سرخ رنگ کا ایک خوبصورت بیگ خریدا۔ کچھ زعفران لیا۔ ٹیکسی پکڑ کر ایئرپورٹ پہنچے۔ از بک ایئرلائن میں سوار ہونے والوں میں پاکستانیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ایک خاندان جس کا تعلق امامیہ کالونی سے تھا۔ ان کا ایک بچہ آذربائیجان میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن ان کو اس کا برتھ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کافی مشکلات پیش آئی تھیں۔ واپس جا رہی تھی۔

تاشقند کے چھوٹے سے ہوائی اڈے پر چند گھنٹوں کا وقفہ تھا۔ جہاں سے لاہور کی فلائٹ پر سوار ہونا تھا۔

میں نے شہزودہ کے بارے میں پوچھا۔ اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ اس سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔ مگر شاید خدا کو منظور نہیں تھا۔

اپنے دیس پہنچنے پر ایسا لگا جیسے ہم اپنا کچھ بھول آئے ہیں باکو کی گلیوں میں!
اتنے برس گزرنے کے بعد آج بھی حاتم طائی کی کہانیوں جیسی حالت ہے کہ
''ایک بار دیکھا ہے۔ دوبارہ دیکھنے کی خواہش ہے''

مضامین

فروغ روی شیریں در دماغش
فراغت دادی از شمع و چراغش
(نظامی گنجوی)

مولانا آغا نعمت اللہ جان درانی......احقر امرتسری

مولانا آغا نعمت اللہ جان درانی......جن کا تخلص احقر امرتسری تھا......میرے دادا جان تھے......ان کو سب بڑے آغا جی......اور بچے بابا جان کہتے تھے......

آغا جی کا بچپن اور جوانی لدھیانہ شہر کے شہزادوں کے محلے میں گزرے...... جہاں افغانستان سے آئے سدوزئی قبیلے کے لوگ آباد تھے۔افغان شاھی خاندان سے تعلق کی وجہ سے یہ سب شہزادے کہلاتے تھے۔حکومت برطانیہ نے ان کے وظائف مقرر کر رکھے تھے......لہٰذا سب شہزادے کبوتر اڑاتے اور بٹیر لڑاتے تھے......آغا جی ان سب سے الگ تھلگ تھے......کتابوں کے رسیا۔علم کے دیوانے......کتابیں پڑھتے۔مذاکروں،مباحثوں میں شرکت کرتے......جہاں سے کوئی حکمت ودانائی کی بات ملتی اسے ذہن نشین کر لیتے......سچ اور جھوٹ کو اپنے علم،فہم اور مطالعہ کی روشنی میں پرکھتے......علما کی صحبت نے ایسی آبیاری کی کہ باب علم سے شہر علم میں داخل ہوئے اور قران ناطق کے عشق میں سرشار ہو کر......تبلیغ،تقریر اور تحریر کے ذریعے درس کربلا کی تشہیر کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا......

سدوزئی قبیلہ جن کا شجرہ نسب احمد شاہ ابدالی سے شروع ہوتا تھا......سنی العقیدہ تھے۔انھوں نے اس درمیانے قدوقامت،گندمی رنگت،کشادہ پیشانی،سیدھی مانگ

اور بڑی بڑی ذہین آنکھوں والے نوجوان کو سمجھانے کی کوشش کی......رشتہ داروں نے ترک تعلقات کی دھمکی دی......مگر ان سب کا ان پر کوئی اثر نا ہوا......وہ تو حب علی واہل بیت میں سرشار ہو چکے تھے......

سب کچھ چھوڑ کر اپنی زوجہ کنیز فاطمہ اور بچوں کے ہمراہ امرتسر چلے گئے...... بہت سے جلسوں میں تقریریں کیں......مناظرے جیتے......کتابیں لکھیں......اسی دوران برصغیر تقسیم ہو گیا......ان کے محلہ شریف پورہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ چند گھر سکھوں اور ہندوؤں کے تھے......فسادات کے دوران ان سب کی حفاظت کی اور انھیں اس علاقے سے بحفاظت نکلنے میں مدد کی......وہ مبلغ اسلام تھے لیکن انسانیت ان کا پہلا مشن تھا......پھر وہ وقت آیا جب انھیں وہاں سے نکلنا پڑا......گھر کے تمام لوگ پہلے ہی پاکستان جا چکے تھے......صرف ان کا بڑا بیٹا آغا اعجاز حسین ان کے ساتھ تھا......اپنے بھرے گھر سے کتابوں کی ایک بوری اٹھائی جسے وہ اور بیٹا باری باری اٹھا کر لاہور لانے میں کامیاب ہو گئے......

لاہور میں پہلے نسبت روڈ اور پھر برانڈرتھ روڈ پر رہائش اختیار کی......امرتسر کے کئی دوست احباب بھی جو فسادات سے بچ کر آنے میں کامیاب ہوئے تھے وہ مل گئے......پھر تحریر و تقریر کا سلسلہ شروع ہوا......موچی دروازہ میں۔امام باڑہ حسینی بیگم، امام باڑہ فتح علی شاہ اور نثار حویلی میں مجالس پڑھنا شروع کیں......"شان عزا" اور "یاد حسین" جیسی کتب تحریر کیں......جو انصاف پریس سے چھپ کر ڈھیروں کی تعداد میں آتی تھیں......

ایوب خان کا مارشل لا لگا......تو ہر مجلس پر پابندی لگنے لگی......جبکہ وہ اپنی تقریر میں کبھی متنازعہ بات نہیں کرتے تھے......گھر اور خاندان والوں کے ساتھ ان کا رویہ دوستانہ اور مشفقانہ تھا......وہ ہر عمر کے لوگوں میں جلدی گھل مل جاتے اور سب کو اپنا

گرویدہ بنا لیتے...... کسی پر اپنے عقائد تھوپنے کی کوشش نہیں کرتے تھے...... اپنے بچوں کی شادیاں بھی سنی العقیدہ خاندانوں میں کیں...... ان کا اخلاق، کردار اور لوگوں سے میل ملاپ کا رویہ ایسا تھا...... کہ ان کے داماد اور بہوئیں خود بخود ان کے مسلک میں شامل ہو گئے۔ رشتہ داروں میں سے بھی کچھ علانیہ اور کچھ ڈھکے چھپے ان کی تائید کرنے لگے......

زندگی بھر کبھی روزہ اور نماز قضا نہیں کی...... لیکن گھر والوں پر کبھی سختی نہیں کی نا ہی کسی کو تنقید کا نشانہ بنایا......

محلے کے بڑوں، بچوں سب کے ساتھ ان کا شفقت اور احترام کا رشتہ تھا۔ جس کو بھی دیکھتے ہمیشہ سلام کرنے میں پہل کرتے...... سب کو اچھے ناموں سے پکارتے۔ محلے میں اہل حدیث کی مسجد تھی...... اس مسجد کے کنویں سے پانی نکال کر ٹینکی میں ڈالتے تا کہ لوگ وضو کر سکیں...... اس مسجد میں نماز بھی ادا کرتے......

ان کا معمول تھا کہ برف خانہ چوک میں ماہنامہ ''اسد'' کے ایڈیٹر شائق انبالوی اور مولانا اظہر حسن زیدی سے ملنے جاتے...... مولانا اظہر حسن زیدی کو ان سے اتنی محبت اور عقیدت تھی کہ انھوں نے ایک پوری مجلس ہی ''نعمت'' کے موضوع پر پڑھ دی...... جب مولانا آغا نعمت اللہ جان ان کے سامنے بیٹھے تھے......

لکشمی چوک میں ''شہید'' کے ایڈیٹر مظفر علی شمسی سے ملنے بھی جاتے...... جہاں ان کے نائب جعفر علی میر بھی ہوتے......

چوک رنگ محل میں ''معارف اسلام'' کا دفتر تھا...... ان تمام رسائل میں ان کے علمی اور تحقیقی مضامین بھی شائع ہوتے تھے......

ہر اتوار کو سفید کرتہ پاجامہ پہن کر کالی شیروانی۔ قراقلی ٹوپی پہنے ہاتھ میں چوبی چھڑی پکڑ کر اندرون موچی گیٹ جاتے...... جہاں ان کے دوست فتح علی شاہ کی

بیٹھک میں ان کے دیگر دوست احباب بھی جمع ہوتے...... کشمیری چائے اور باقر خوانیوں کے ساتھ علمی مباحث کا سلسلہ بھی جاری رہتا......

اس محفل کے اختتام پر وہ اپنی اکلوتی ہمشیرہ صغرا بی بی سے ملنے جاتے...... جو بیوہ تھیں اپنے دو بچوں کے ساتھ اندرون موچی گیٹ میں رہتی تھیں اور ایک سرکاری سکول میں تدریسی فرائض انجام دے رہی تھیں...... ان کے بڑے بھائی اسداللہ خان بھی ان سے ملنے وہاں آجاتے...... بہن بھائیوں کی محبت کے باوجود ان میں ایک مسلکی دوری موجود رہتی جو آخر دم تک قائم رہی......

میں نے بابا جان کو ہمیشہ آنکھوں میں سرمہ لگائے، سیدھی مانگ نکالے۔ کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھ کر دن کی روشنی میں کتابیں پڑھتے، ان میں نشان لگاتے اور حاشیوں پر نوٹس لکھتے دیکھا...... ان کی کتابوں میں سے کتابیں اٹھا کر اردو پڑھنا سیکھا......

آغا جی گھر میں فارسی اور پنجابی بولتے تھے...... مگر تقاریر اردو میں کرتے تھے...... کتابیں بھی اردو میں لکھتے تھے......

ان کی اپنی کتابوں کے اندر پہلے صفحے پر ان کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر ہوتی تھی جس میں وہ شیروانی پہنے بے ریش نظر آتے تھے۔

اس تصویر کے نیچے یہ شعر درج ہوتا......

جو ہے تحریر میں پنہاں وہ حقیقت دیکھو
میری صورت کو نہ دیکھو میری سیرت دیکھو

ان کی نثر میں بھی جا بجا اساتذہ کے اشعار شامل ہوتے......

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

گھر میں اکثر ڈیڈی اور بابا جان آپس میں شعروں کی زبان میں گفتگو کرتے، اس لیے ہمیں بھی غالب اور اقبال کے اکثر اشعار حفظ ہو گئے تھے......

جس دن آغا جی پر فالج کا حملہ ہوا......ہم سب میو ہسپتال میں ان کے پاس بیٹھے تھے......میں نے پوچھا۔ ''بابا جان کیسے ہیں؟''

ان کے چہرے پر عجیب بے بسی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود جواب نہ دے پا رہے تھے......میں نے کہا

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

یہ سن کر انھوں نے مسکرانے کی کوشش کی......کچھ دیر بعد جب ہم گھر جانے لگے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا......''بابا جان ہم گھر جائیں''

انھوں نے آنکھوں سے رکنے کا اشارہ کیا......جس پر میں نے کہا......

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ میرا اپنے بابا جان کے ساتھ آخری مکالمہ تھا......

محسن نقوی......آوارگی اور ذاکر اہلبیت

یہ دل یہ پاگل دل میرا......کیوں بجھ گیا آوارگی......غلام علی کی آواز میں جس نے بھی یہ غزل سنی اس کا دیوانہ ہو گیا......پتہ چلا ڈیرہ غازی خان کا کوئی شاعر ہے......اسد نذیر نے مجھے محسن نقوی کی کتاب ''برگ صحرا'' لا کر دی......شاعری ایسی تھی کہ ایک نشست میں ہی ساری کتاب پڑھ ڈالی......

ماوراوالے خالد شریف نے خوبصورت کتابیں چھاپنے کی طرح ڈالی تو سب سے پہلے محسن نقوی کی کتابیں نہایت دلکش سرورق اور چمکتے کاغذ پر چھاپیں......یہ کتابیں اپنے ظاہری اور باطنی حسن کی بدولت نہایت مقبول ہوئیں......

محسن نقوی لاہور آ چکے تھے۔ اور ان کی شہرت شاعر، سیاست دان اور ذاکر اہلبیت کی حیثیت سے ملک کے طول وارض میں پھیل چکی تھی......

پاکستان ٹیلی وژن کے ایک مشاعرے میں ان سے ملاقات ہوئی۔ گھنگھریالے بالوں، شرارتی آنکھوں اور خوبصورت لب و لہجے میں اردو بولتے ہوئے وہ ہمارے محسن بھائی بن گئے۔ میں نے ان کو ہنستے دیکھا، شعر سناتے دیکھا، مجلس پڑھتے دیکھا۔ چوک نواب صاحب میں جعفر علی میر کے گھر کے باہر مجلس کے اختتام پر تابوت امام حسن کو دیکھ کر علامہ عرفان حیدر عابدی کے ساتھ لپٹ کر زاروقطار روتے دیکھا۔

بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں انھوں نے پاکستان ٹیلی وژن کے ایک ادبی پروگرام کی میزبانی بھی کی جب بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی تو انھوں نے ایک نعرہ لکھا ''یا اللہ یا رسول، بے نظیر بے قصور'' جو پاکستان کے ہر در و دیوار پر لکھا نظر آتا تھا۔

محسن نقوی نے اپنی کچھ کتابیں اپنے دستخط کے ساتھ بھی دیں۔ ان کی لکھائی اتنی خوبصورت تھی جیسے لفظوں کے موتی پروئے ہوں......

مختلف کالجوں میں مشاعروں کا دور جاری ہوا۔ اکثر مشاعرہ ان کی صدارت میں ہوتا میں مہمان خصوصی ہوتی۔ اپوا گرلز کالج جیل روڈ لاہور کا مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ ختم ہوا وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ میرے ساتھ میری گاڑی تک آئے۔ میں نے کہا اب اسلامیہ کالج کوپر روڈ پر ملاقات ہو گی۔ اس دن وہ رکنا چاہتے تھے، کچھ کہنا چاہتے تھے۔ میں نے خدا حافظ کہا، گاڑی میں بیٹھ کر۔ پلٹ کر دیکھا وہ وہیں کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر عجیب سی اداسی تھی۔

17 جنوری کو کوپر روڈ اسلامیہ کالج برائے خواتین میں مشاعرہ تھا جس کی صدارت محسن نقوی نے کرنی تھی...... میں مہمان خصوصی تھی......

15 جنوری کی سہ پہر علامہ اقبال ٹاؤن کی مارکیٹ میں اپنے دفتر کے قریب جب وہ پان فروش سے پان خرید رہے تھے۔ نامعلوم دہشت گردوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے خوبصورت لفظوں سے محبت پرونے والے شاعر محسن نقوی کو شہید کر دیا۔

17 جنوری اسلامیہ کالج کوپر روڈ پر سب لوگ مشاعرے میں موجود تھے۔ سسکیوں، آہوں کے ساتھ محسن نقوی کو یاد کر رہے تھے...... میری صدارت تھی آنکھوں میں آنسو تھے آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی...... میں نے اپنا کلام سنانے کی بجائے محسن نقوی کا یہ شعر سنا کر اجازت چاہی۔

ملاقاتیں ادھوری رہ گئی ہیں کئی باتیں ضروری رہ گئی ہیں

مشیر کاظمی......شاعرِ پاکستان

ہمارے بچپن میں جب بھی روز عاشور آتا۔ ہمارے ڈیڈی آغا اعجاز حسین درانی مجھے اور میرے بھائی مدثر کو ساتھ لے کر اندرون دہلی گیٹ کوتوالی چوک میں زیارت ذوالجناح کے لیے لے کر جاتے......سرخ منقش چھتری کی چھاوں میں سفید ذوالجناح سونے چاندی کے زیورات اور گلاب اور گیندے کے پھولوں سے لدا ہوا۔ چوہٹہ مفتی باقر سے کوتوالی چوک میں داخل ہوتا......جس کے ساتھ نواب مظفر علی خان قزلباش سیاہ کرتہ، سفید شلوار، گلے میں سونے کی زنجیر پہنے ایک ہاتھ سینے پر دوسرے ہاتھ سے ذوالجناح کی لگام تھامے ہوئے ہوتے......''یاحسین'' کی صداوں کے ساتھ زنجیر کا ماتم شروع ہو جاتا......ڈیڈی ہمیں لے کر کسی دکان کے تھڑے پر کھڑے ہو جاتے......اور کچھ دیر بعد ہم وہاں سے اتر کر۔ نوحہ خواں پارٹیوں کے عقب سے راستہ بناتے ہوئے رنگ محل سنہری مسجد کی طرف چل پڑتے۔ اسی راستے میں ہمیں چچا مشیر کاظمی ملتے دراز قد، پروقار، سیاہ لباس پہنے......اپنے دو بیٹوں کی انگلیاں تھامے......ڈیڈی اور چچا ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتے۔ چچا ہمارے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے اور پھر جلوس میں شامل ہو جاتے......یہ ملاقات سال میں ایک بار روز عاشور پر ہی ہوتی۔ لیکن ہمارے ڈیڈی ہمیں بتاتے کہ ان کا نام مشیر کاظمی

ہے اور یہ بہت بڑے شاعر ہیں......ہمیں بچپن سے ہی قلم اور قلم سے جڑے لوگوں کی اہمیت اور عزت کرنا سکھائی گئی......

چچا مشیر کاظمی کو شاعر پاکستان کا لقب حاصل تھا۔ وہ فلموں کے لیے بھی گیت لکھتے تھے...... بڑے بڑے مشاعروں کا انعقاد کرتے......اس وقت کے صدر پاکستان محمد ایوب خان کے جلسوں میں قومی وملی نغمے سناتے......1965 کی جنگ کے دوران ان کے قومی نغمے بہت مقبول ہوئے۔

ابھی میں سکول میں ہی تھی۔ ڈیڈی نے چچا مشیر کاظمی کو بتایا کہ یہ بھی شاعری کرتی ہے...... یہ سن کر بہت خوش ہوئے......ساتھ ہی مجھے ایک مشاعرے میں شرکت کی دعوت دے دی۔

مشاعرہ ایمبیسیڈر ہوٹل لاہور میں تھا۔ میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ گئی۔ مشاعرے کی صدارت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر علامہ علاؤالدین صدیقی کی تھی۔ سٹیج پر ان کے ساتھ نامور شعرا تشریف رکھتے تھے۔ لیکن اس وقت مجھے کسی کی پہچان نہیں تھی......عبدالحمید عدم اس لیے یاد رہے کیونکہ ان کو دو لوگوں نے پکڑ کر سہارا دے کر سٹیج تک پہنچایا تھا۔

سب سے کم عمر اور نوآموز ہونے کے باعث۔ سب سے پہلے مجھے ہی پڑھوایا گیا......میں نے 1965 کی جنگ پر لکھی اپنی نظم سنائی۔

پچھلی رات کے سائے تھے دھرتی سے جب آگ اٹھی
سوئی ہوئی تھی شیر کی نیند قوم ہماری جاگ اٹھی

یہ میری زندگی کا پہلا مشاعرہ تھا۔ واپسی پر میں نے ہوٹل کی لابی میں احمد عقیل روبی، منور سلطانہ لکھنوی اور لیڈی ڈاکٹر نسیم اعظم کو بیٹھے دیکھا......

جب مشیر کاظمی نے اپنا رسالہ ''خانم'' شروع کیا۔ تو اس میں میرا نام بطور معاون

مدیرہ کے شامل کر لیا...... جبکہ اس رسالے کا سارا کام وہ خود ہی کرتے تھے۔ مجھے تو ہر مہینے رسالہ پڑھنے کے لیے مل جاتا تھا......

ان دنوں وہ بہت خوشحال تھے۔ ان کی بیگم روبینہ شاہین بھی مجھے بہت پیار کرتی تھیں...... آنٹی روبینہ شاھین بہت خوبصورت، خوش لباس اور خوش مزاج تھیں...... سنا تھا کہ وہ ریڈیو پاکستان کی خوبصورت آواز بھی ہیں۔ غزل اور گیت گاتی ہیں لیکن ان سے اس موضوع پر بات کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی...... چچا مشیر کاظمی دراز قد، نہایت بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے کچھ فلموں میں اداکاری بھی کی تھی...... ان کی رہائش لکشمی چوک کے قریب رائل پارک کے علاقے میں تھی۔ ''خانم'' کا دفتر بھی گھر پر ہی تھا۔

صدر ایوب خان کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ان پر بھی مشکل حالات آ گئے۔ روٹ پرمٹ بس مالکان کو دے دیئے گئے۔ جن سے ان کی ماہانہ آمدنی وابستہ تھی۔ وہ ختم ہو گئی

انھوں نے سمن آباد میں ایک سکول شروع کیا۔ ان کی رہائش سکول کی بالائی منزل پر تھی...... ہماری رہائش بھی سمن آباد میں تھی...... میں بی اے کے امتحان سے فارغ ہو کر رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ دو ماہ کے لیے میں نے بھی اس سکول میں پڑھانا شروع کیا...... اب ان سے روز ہی ملاقات ہوتی...... کبھی کبھی چچا مشیر کاظمی بہت اداس ہوتے تو اپنے بچپن کے واقعات سناتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے۔

انھوں نے بتایا کہ نوجوانی میں انھیں فلمی ہیرو بننے کا شوق تھا۔ وہ اپنی والدہ کے زیور چرا کر بمبئی چلے گئے تھے...... اسی دوران ملک میں فسادات شروع ہو گئے...... جب وہ گھر واپس آئے تو گھر کے آنگن میں ان کے عزیز واقارب اور والدین کی لاشیں پڑی تھیں...... گھر کے صحن والے کنویں میں بہنوں کی لاشیں تیر رہی تھیں......

جب وہ لاہور کیمپ میں پہنچے تو ان کا چھوٹا بھائی ان کو مل گیا...... جس وقت حملہ آور گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ گھر سے باہر بھاگ گیا تھا...... اپنے پورے خاندان میں صرف یہ دونوں زندہ بچ سکے تھے۔ جو پاکستان پہنچ گئے...... سمن آباد والا اسکول بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا...... مشیر کاظمی اپنی فیملی سمیت سمن آباد سے کہیں اور شفٹ ہو گئے...... ان سے رابطہ نا رہا۔

جب میں پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس شعبہ صحافت میں تھی۔ تو شعبہ صحافت کی طرف سے مشیر کاظمی کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا گیا...... مشیر کاظمی صدر شعبہ مسکین علی حجازی کے ساتھ سٹیج پر بیٹھے تھے...... میں ہال کی پچھلی صف میں دیگر طالبات کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی تو انھوں نے مجھے سٹیج پر آ کر کلام سنا نے کے لیے کہا...... یہ تقریب ان کے اعزاز میں تھی۔ مشاعرہ نہیں تھا۔ ان کا اس طرح مجھے کلام سنانے کا کہنا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا...... شاید اس وقت تک میرے استاد اور ہم جماعت بھی نہیں جانتے تھے کہ میں شعر کہتی ہوں...... میں نے اپنی نظم ''نیلی آنکھیں'' سنائی...... جس پر مشیر کاظمی اور ہال میں موجود سب لوگوں نے کھل کر داد دی...... افسوس کہ یہ میری چچا مشیر کاظمی سے آخری ملاقات تھی...... اب جب بھی میں اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لیے مومن پورہ قبرستان جاتی ہوں تو دروازے کے پاس رک کر انھیں سلام اور فاتحہ کا ہدیہ پیش کرتی ہوں۔ تو مجھے محسوس ہوتا ہے وہ اب بھی اپنی باوقار شخصیت اور مہربان مسکراہٹ کے ساتھ اپنا شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر رکھتے ہیں...... جب تک ان کے گیت اس فضا میں گونجتے رہیں گے وہ زندہ رہیں گے......

چاندنی راتیں...... سب جگ سوئے ہم جاگیں، تاروں سے کریں باتیں......

لاہور میں دہشت گردی کا پہلا شہید: آقائی صادق گنجی

انٹرنیشنل ہوٹل میں سیما پیروز کی کتاب کی تقریب تھی۔ لاہور کے تمام معروف شاعر ادیب جمع تھے۔ اظہر جاوید نے ایک نورانی چہرے والے نوجوان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا "یہ خانہ فرہنگ ایران کے ڈائرکٹر جنرل آقائی صادق گنجی ہیں۔
ان کو دیکھ کر خوشی بھی ہوئی مگر حیرت زیادہ...... کیونکہ میں سمجھتی تھی آقائی صادق گنجی کوئی بزرگ ہوں گے...... وہ اپنے اخلاق اور کردار میں واقعی بزرگ تھے...... انھوں نے اہل لاہور کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا...... اس سرسری ملاقات کے بعد کافی عرصہ ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا...... پھر ایک تقریب میں سامنا ہوا تو انھوں نے نام لے کر احوال پوچھا...... جس پر ان کی ذہانت اور یادداشت پر حیرت ہوئی۔ جبکہ میں دل ہی دل میں شرمندہ تھی کہ ان کو پہچان نہ پائی تھی...... ان کا عوامی مزاج ہر ایک سے ایسے ملنا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو...... اور خوبصورت لہجے میں اردو بولنا اتنا دلپذیر تھا کہ وہ لاہوریوں کے دل میں اتر گئے تھے۔ ہر کوئی ان کو اپنا دوست اور عزیز ساتھی سمجھتا...... ان میں نا تو عہدے کا غرور تھا اور نا ہی غیر ملکی ہونے کی اجنبیت...... جب کسی تقریب میں مدعو کرنا ہوتا...... ٹیلی فون آپریٹر کی بجائے خود فون کرتے۔ میں ان کے مخصوص لہجے میں ہیلو سن کر کہتی"۔ کیسے ہیں گنجی بھائی؟"...... تو ہنس کر پوچھتے

''آپ نے کیسے پہچانا؟''......ایک روز پتہ چلا کہ وہ ایران واپس جا رہے ہیں...... وہاں ان کو کوئی بڑی ذمہ داری ملنے والی ہے......اب ان کے اعزاز میں الوداعی تقریبات کا سلسلہ شروع ہوا......سرفراز سید نے اپنے گھر میں الوداعی تقریب رکھی......جس میں حیات احمد خان، پرویز مراد، ان کی بیوی جوائس مراد (جنہوں نے بعد میں حنیف رامے سے شادی کی) آقائی صادق گنجی ان کی بیگم خانم اعظم اور بہت سے شاعر ادیب جمع تھے۔میری دوسری کتاب اسی دن پبلشر نے دی تھی۔''جب نہر کنارے شام ڈھلی'' کتاب دیکھ کر شرارت سے کہا۔''آپ کی تصویر تو بلیک اینڈ وائٹ ہے۔اچھی نہیں ہے''۔میں نے کہا''شوہر اپنی بیویوں کی ایسی ہی تصویر بناتے ہیں''جس پر سب ہنسنے لگے۔کھانے کے بعد حیات احمد خان نے ستار پر کچھ دھنیں بجائیں......

اس طرح کی کئی تقریبات ہوئیں......سب سے بڑی تقریب آواری ہوٹل میں ہوئی جس میں وزیر اعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائین بھی شریک ہوئے۔حسن رضوی نظامت کر رہے تھے۔سب شزکا نے صادق گنجی کو سرخ گلابوں کے ہار پہنائے...... لوگ تقاریر کر رہے تھے۔صادق گنجی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ہال میں موجود لوگ بھی ایک دوسرے سے اپنے آنسو چھپانے کی کوششوں میں تھے......خانم اعظم گنجی کو خطاب کی دعوت دی گئی۔وہ فارسی میں تقریر کر رہی تھیں......مترجم خاتون کو ہٹا دیا گیا۔کیونکہ ان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سامعین کے دلوں میں اتر رہے تھے۔جذبوں کے لیے کسی ترجمے کی ضرورت نہی تھی......یہ آنسوؤں اور پھولوں سے مہکتی تقریب دیر تک جاری رہی مگر سامعین میں سے کوئی بھی اٹھ کر نہیں گیا......

دوسرے روز میں خانہ فرہنگ ایران میں ان سے ملنے گئی تو آقائی صادق گنجی دفتر میں مصروف تھے۔ان سے کچھ باریش لوگ ملنے آئے تھے جو ان کا کسی رسالے

کے لیے انٹرویو لے رہے تھے...... میں خانم اعظم کے پاس بیٹھی رہی۔ ان کے دونوں بچے پاس کھیل رہے تھے۔ میں نے خانم اعظم کو سرخ دوپٹہ اوڑھایا جو میں ان کے لیے لے کر گئی تھی...... وہ خوش تھیں کہ واپس اپنے وطن جا رہی ہیں......

دو روز بعد یہ منحوس خبر سنی کہ آقائی صادق گنجی شہید ہو گئے ہیں۔ کانوں کو یقین نہیں آیا...... اتنے پیارے محبت اور انسانیت کے پیکر کو کون مار سکتا ہے...... وہ جو غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کے مالک تھے ابھی صرف چھبیس برس کے تھے۔ انھوں نے ابھی بہت سے کام کرنے تھے۔ اپنے بچوں کو بڑا ہوتے دیکھنا تھا۔ ان کو ناحق خون سے نہلا دیا گیا۔

انٹرنیشنل ہوٹل میں معصوم عابدی نے کوئی تقریب رکھی تھی...... صادق گنجی جانا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ اس تقریب میں موسیقی کا پروگرام بھی تھا...... انھوں نے جانے سے انکار کیا...... مگر حسن رضوی کے اصرار پر کہ تھوڑی دیر رک کر واپس آ جائیں گے...... وہ آمادہ ہو گئے...... ان کی گاڑی جونہی انٹرنیشنل ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہوئی...... دہشت گردوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی...... ساتھ بیٹھے حسن رضوی کو خراش تک نہیں آئی...... کیونکہ حملہ ہونے سے پہلے ہی وہ زمین پر لیٹ گئے تھے...... معصوم عابدی بھی گولیوں کی بوچھاڑ سے بچ گئے...... جبکہ وہ استقبال کے لیے سیڑھیوں میں کھڑے تھے...... ساری گولیاں اس خوبصورت نوجوان کو لگیں۔ جس کا دل اور روح اس کے کردار کی طرح پاکیزہ اور معطر تھا۔ جو صرف محبت کرنا جانتا تھا...... جو لاہور اور لاہوریوں کی محبت میں آنسو بہاتا تھا...... اس کا سرخ گلابوں والا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا...... ابھی ایک دن پہلے ہی تو انھوں نے مجھے قرآن پاک کا تحفہ دیتے ہوئے کہا تھا...... ''اب ہماری ملاقات ایران میں ہو گی''

یونانی دیوتا یا پری پیکر......عمران خان

وہ تالیاں بجا رہی تھیں......ہنس رہی تھیں......گا رہی تھیں......اور پھر منتیں کر رہی تھیں......ایک بار......بس ایک بار......وہاں تک جانے دو......جہاں وہ شہزادہ کھڑا ہے......یا پویلین کے آس پاس......اس کی ایک جھلک دیکھنے دو......قریب سے بس ایک جھلک......

دیکھو ہم کالج سے کلاسیں چھوڑ کر آئی ہیں......اس کو دیکھنے کے لیے......کچھ دیر بعد ہمارے بابا یا بھائی ہمیں لینے آ جائیں گے......

آپ کتنی اچھی ہیں......آپ کتنی سندر ہیں......یہ پولیس یونیفارم آپ پر بہت جچتا ہے......بس ایک بار......اس کو قریب سے دیکھنے دو......کتنا ظالم ہے فیلڈنگ کے لیے بھی گراؤنڈ کے دوسری طرف کھڑا ہوتا ہے۔

کرکٹ میچوں کے دوران میری ڈیوٹی اکثر وی آئی پی لاؤنج میں لگتی......میں جب بھی اپنی ساتھی افسروں سے ملنے خواتین کے حصے کی طرف جاتی تو یہ مناظر مجھے گھیر لیتے......

وہ سب بہت حسین تھیں، نوخیز تھیں، نوعمر تھیں......ان کی موجودگی سے سارا سٹیڈیم رنگ اور خوشبو سے بھر جاتا......ان کی ہنسی، ان کے قہقہے......ان کے گیت،

ان کی تالیاں...... وہ ہی تو میرے شہر کی رونق تھیں...... جو اس کی ایک جھلک دیکھنے کو جمع ہوتیں...... میں ہنس ہنس کر ان کو ٹالتی رہتی...... وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتیں...... گھٹنوں کو ہاتھ لگاتیں...... پیارے پیارے ناموں سے پکارتیں...... دیکھو آپ بھی تو ہمارے جیسی ہو...... ہماری ہم عمر...... پھر آپ سمجھتی کیوں نہیں...... کیا آپ کو وہ اچھا نہیں لگتا...... آپ تو اس کے قریب جا سکتی ہیں...... وی وی آئی پی گیٹ...... پویلین کے پاس...... بس ہمیں ساتھ لے جائیں...... یا پھر ہماری آٹو گراف بک پر اس کا آٹو گراف لا دیں......

میری ساتھی عاصمی خان ان سے آٹو گراف بکس لے لیتی...... میں اسے پوچھتی ایسا کیوں کر رہی ہو...... وہ کہتی یہ ماننے والی نہیں ہیں...... اب آرام سے بیٹھ جائیں گی...... شام کو واپس کر دیں گے......

میں واپس اپنے ڈیوٹی پوائنٹ وی وی ائی پی لاؤنج میں آ جاتی......

میچ کا وقت ختم ہوتا تو ہم اپنی بانہوں کا حصار بنا کر پویلین گیٹ کے باہر کھڑے ہو جاتے...... عوام کا ہجوم گیٹ کے باہر امڈ آتا......

کھلاڑی گزرتے رہتے...... کچھ دیکھتے، کچھ ہاتھ ہلاتے...... مگر وہ سب سے لاپرواہ اپنی ہی دھن میں مگن...... بے نیاز سا...... بغیر کسی طرف دیکھے گزر جاتا......

لڑکیاں جو کھیل ختم ہوتے ہی یہاں آ چکی ہوتیں...... ایک دوسرے کو دھکے دیتیں...... شور مچاتیں...... نعرے لگاتیں...... مگر وہ نظر اٹھا کر بھی نا دیکھتا...... مغرور کہیں کا......

کراچی سے نکلنے والے منیر حسین کے ماہنامہ کے ٹائٹل پر اس کی تصویر چھپی...... تو ہر کسی کے ہاتھ میں وہ رسالہ نظر آیا...... جس میں منیر حسین نے اسے ''یونانی دیوتا'' لکھا تھا......

ان دنوں پاکستانی کرکٹ ٹیم سٹارز سے بھری ہوئی تھی...... مشتاق محمد، جاوید

میاں داد، ماجد خان، وسیم باری، ظہیر عباس، آصف اقبال......

بھارت کی ٹیم آئی تو...... سنیل گواسکر، کپل دیو، کرمانی، بشن سنگھ بیدی بھی آئے...... میری ڈیوٹی صدر پاکستان ضیاء الحق کے ساتھ تھی...... بھارت سے منصور پٹودی اوران کی والدہ بیگم نواب پٹودی بھی میچ دیکھنے آئی تھیں...... فلمی اداکاروں میں منوج کمار اور شترو گھن سنہا موجود تھے...... مجھے سارا وقت وی وی آئی پی لاؤنج میں رہنا پڑا......

لڑکیوں کے اصرار پر سب انسپکٹر شگفتہ نے کپل دیو سے آٹو گراف لے لیا...... کسی اخباری فوٹوگرافر نے یہ تصویر بنالی جو دوسرے روز اخبار میں چھپ گئی...... شکر ہے اس دور میں یہ میڈیا نہیں تھا صرف پی ٹی وی تھا۔ جو اپنے تین کیمروں سے میچ کی کوریج کرتا تھا...... ورنہ نجانے اس واقعہ کو کس کس طرح اور کس کس اینگل سے ٹی وی پر دکھایا جاتا...... اور اس پر کس کس طرح کے تجزیے ہوتے......

شگفتہ کے خلاف انکوائری ہوئی...... اس کو ایس ایس پی لاہور سعادت اللہ خان کے سامنے پیش کیا گیا...... جنہوں نے یہ کہہ کر انکوائری داخل دفتر کردی...... کہ آئندہ ڈیوٹی کے دوران کسی کرکٹر سے بات نہ کریں۔ خاص طور پر بھارتی کرکٹر سے دور رہیں......

سیالکوٹ میں پاکستان اور ویسٹ انڈیز کی کرکٹ ٹیموں کے درمیان میچ تھا...... مجھے خواتین پولیس کی انچارج ہونے کے ناطے جانا پڑا...... ہماری رہائش کا بندوبست گورنمنٹ گرلز کالج میں لڑکیوں کے ہاسٹل میں تھا...... یہاں بھی لڑکیوں کی وہی فرمائشیں تھیں...... بس ایک بار اس سے بات کرنے دیں...... یا ہمیں اس جگہ بیٹھنے دیں جہاں سے وہ دکھائی دے...... ہم تو صرف اس کو دیکھنے جائیں گی......

سیالکوٹ میں سٹیڈیم نہیں تھا...... یہ میچ ایک گراؤنڈ میں کھیلا جانا تھا...... اس لحاظ

سے یہ ڈیوٹی زیادہ مشکل تھی......

دوسری صبح میچ شروع ہوا......ویسٹ انڈیز کے کپتان کلائیو لائیڈ کی وجاہت کے سامنے سارے گورے چٹے پاکستانی پھیکے لگ رہے تھے......مگر لڑکیاں اسی کے گن گا رہی تھیں......وہ جو سب سے الگ تھا......چنی آنکھوں والا......جس کی آنکھیں دھوپ میں بند دکھائی دیتی تھیں......یا شاید وہ اتنا خود پرست تھا......کہ اپنے علاوہ کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا......

ویسٹ انڈیز ٹیم کے مینیجر سابق کپتان روھن کنہائی نے پاس سے گزرتے ہوئے میری تعریف کی......''میں نے یونیفارم میں اتنی خوبصورت آفیسر کبھی نہیں دیکھی''......میں شکریہ بھی نہ کہہ سکی......کیونکہ ہمیں ان سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی......

ہمارے دوپہر کے کھانے کا انتظام سیالکوٹ کے ایس ایس پی طاہر انور پاشا کی طرف سے تھا......گرلز ہاسٹل میں رہائش اور ناشتہ کا بندوبست بھی انھوں نے کیا تھا......شام کو میچ ختم ہوتے ہی ہم لاہور کی طرف روانہ ہوئے......ہماری یہ ڈیوٹی ایک پکنک کی طرح یادگار تھی......گو ہاسٹل کی لڑکیاں ہم سے ناراض تھیں کہ ہم نے ان کو گراؤنڈ میں سختی سے روکے رکھا تھا......

پاکستان ٹیلی ویژن کے جنرل مینیجر محمد نثار حسین نے پی ٹی وی پر ایک نئے پروگرام کا آغاز کیا......سٹوڈیو ون......اس کے میزبان محمد ادریس تھے......محمد ادریس صحافی تھے......روزنامہ پاکستان ٹائمز میں کام کرتے تھے......کرکٹ کے کمنٹیٹر تھے......ان کے پروگرام میں مختلف شعبوں کے لوگوں کو بلایا جاتا......ان سے بات چیت کی جاتی......

میں ان دنوں پاکستان ٹیلی ویژن پر اناؤنسر تھی......دن میں پولیس کی ڈیوٹی کرتی۔شام کو ٹیلی ویژن پر اناؤنسمنٹ کرتی......جن دنوں پولیس سے چھٹی ہوتی تو

کرکٹ کے ٹیسٹ میچوں کی ٹرانسمیشن پر ڈیوٹی لگ جاتی......

یہ دن میرے لیے بہت بورنگ ہوتے......صبح سویرے تیار ہو کر کیمرے کے سامنے اناؤنسمنٹ کرنی ہوتی......''ہم آپ کو......سٹیڈیم لیے چلتے ہیں۔ جہاں سے آپ ٹسٹ میچ کے پہلے دن کا میچ ملاحظہ فرمائیں گے......اور پھر سپانسر کرنے والوں کی فہرست بتانی پڑتی......''

بارہ بجے کھانے کے وقفے کی اناؤنسمنٹ کے بعد دو تین گانے لگائے جاتے......اور پھر ناظرین کو دوبارہ سٹیڈیم چلنے کی اناؤنسمنٹ کرنی ہوتی......

شام پانچ بجے میچ کے اختتام پر ناظرین سے اجازت لیتے......اور ٹی وی کی باقاعدہ نشریات کا آغاز ہوتا......

سارا دن صوفے پر بیٹھ کر میچ دیکھنا اور اناؤنسمنٹ کا انتظار کرنا......کافی تھکا دینے والا کام تھا......مگر جب آہستہ آہستہ کھیل کی سمجھ آنے لگی......کرکٹرز کے نام اور چہرے جانے پہچانے لگنے لگے......تو بوریت کم ہونے لگی......

ایک شام میں پی ٹی وی میک اپ روم کے باہر کوریڈور میں کھڑی تھی کہ اچانک وہ سامنے آ گیا......دراز قد، گھنگریالے بالوں مندھی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا......''سٹوڈیو ون کہاں ہے''۔اس کے ساتھی نے پوچھا......

میں نے دائیں طرف اشارہ کیا اور وہ دونوں اس طرف چلے گئے......پوچھنے والا ماجد خان تھا......ڈاکٹر جہانگیر خان کا بیٹا......اس کا خالہ زاد بھائی......پروگرام کی ریکارڈنگ شروع ہوئی......محمد ادریس نے کہا......کیری پیکر ہمارے پری پیکر لے گیا ہے......آج میں نے اپنے پروگرام میں ان ''پری پیکروں کو مدعو کیا ہے''۔

اوول کا ہیرو...... فضل محمود

بدمزاج ساس چھ نندوں اور ان کے گھر داماد شوہروں نے زندگی حرام کر رکھی تھی۔

ساس نندوں کی گالیاں کھا کر
ہم نے جینے کا ڈھنگ سیکھا ہے

سسر صاحب بیوی اور بیٹیوں کے ہاتھوں مجبور اور بے بس تھے اور ''سگ باش برادر خورد مباش'' کا محاورہ شوہر صاحب کے لیے بنا تھا۔ لہٰذا ہم نے گڑھی شاہو میں فضل سٹریٹ پر ایک گھر کی بالائی منزل کرائے پر لے لی۔

بالکونی کے سامنے ایک بڑا سا گھر تھا جس کے ایک طرف ایک انیکسی تھی اور بڑے سے باغ میں رنگ برنگ گلاب کے پودے تھے۔

یہاں نیلی آنکھوں والے خوبرو کرکٹر فضل محمود رہتے تھے۔ وہ اس وقت پولیس میں ڈی آئی جی تھے۔ روزانہ شام کو وہ اور ان کی بیٹی شائستہ اپنے باغیچے میں بیٹھ کر شام کی چائے پیتے۔ شائستہ اپنے والد کی طرح بہت خوبصورت تھی۔

فضل محمود کا ذکر میں نے اپنی امی سے بہت سنا تھا۔ امی کا گھر برانڈرتھ روڈ پر تھا جہاں وہ پیدا ہوئی تھیں۔ میں بھی اسی گھر میں پیدا ہوئی اور اسی سکول سے تعلیم حاصل کی جہاں میری امی پڑھتی رہی تھیں۔

اس گھر کی تیسری منزل کی کھڑکیاں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی گراؤنڈ میں کھلتی تھیں۔اسی کھڑکی سے امی نے فضل محمود کو کرکٹ کھیلتے دیکھا تھا۔

اسی کھڑکی سے امی نے قائداعظم محمد علی جناح کو بھی دیکھا تھا۔جب وہ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں تقریر کررہے تھے تو خاکسار تحریک کے بانی علامہ مشرقی نے مسجد میں جا کر اذان دینی شروع کردی۔قائداعظم نے اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھ کر کہا ابھی نماز کا وقت نہیں ہے اور تقریر جاری رکھی جس پر خاکساروں نے ان پر بیلچوں سے حملہ کردیا۔انتظامیہ نے قائداعظم کو اپنی حفاظت میں لے کر گاڑی تک پہنچایا۔

یہ سب واقعات میں نے امی سے کئی بار سن رکھے تھے۔فضل محمود کا نام بھی اجنبی نہیں تھا۔

فضل محمود کا بڑا بیٹا شاہد اور اس کے بیوی بچے گھر کے دوسرے حصے میں رہتے تھے۔

فضل محمود کی بیٹی شائستہ اور چھوٹا بیٹا شہزاد (بنٹی) ان کے ساتھ تھا۔بیگم کو طلاق دے چکے تھے لیکن وہ کبھی کبھار بچوں سے ملنے آتی تھیں۔

گھر میں ایک ادھیڑ عمر ملازمہ تھی جس نے گھر سنبھالا ہوا تھا۔

ایک دن مجھے پیغام ملا کہ فضل محمود نے مجھے چائے پر بلایا ہے۔

میں ان کے گھر گئی۔وہ حسب معمول شائستہ کے ساتھ گھر کے لان میں بیٹھے تھے۔

انہوں نے چائے کے دوران بتایا کہ مجھ سے ملنا شائستہ کی خواہش تھی۔اس کے بعد انھوں نے اپنے گلاب کے تمام پودوں کا تعارف کروایا کہ وہ کس کس ملک سے خریدے گئے ہیں۔

اپنی انیکسی کے بارے میں بتایا کہ یہ چار مرلے میں ہے۔جسے ان کے آرکیٹکٹ داماد جواُن کی بڑی بیٹی شاہدہ کے شوہر ہیں اور اسلام آباد میں مقیم ہیں، نے ڈیزائن کیا ہے۔

اس کی بیسمنٹ میں لائبریری بھی تھی۔شائستہ نے لاہور کالج سے گریجوایشن کیا تھا۔

اب وہ گھر پر ہی رہتی تھی۔ فضل محمود کی خواہش اور کوشش کے باوجود ان کے بیٹے کرکٹ سے وابستہ نہ ہو سکے تھے۔ فضل محمود نے طاہر القادری کی بیعت کر رکھی تھی اور ان کے ٹی وی پروگراموں کی ریکارڈنگز میں بھی شامل ہوتے تھے۔

میرا مالک مکان حیران تھا کہ انھوں نے مجھے کیسے بلا لیا کیونکہ وہ محلہ میں کسی سے میل جول نہیں رکھتے تھے۔

ہم اس گھر میں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکے۔ سسر کی علالت کے باعث جہنم جیسے آسیب زدہ گھر میں دوبارہ جانا پڑا۔

کتنے آسیبوں، بلاؤں کی تھی وہ آماجگاہ
نفرتوں کی دھوپ سہنے ہم کو گھر جانا پڑا

میری ڈی ایس پی عہدہ پر ترقی ہوئی تو پہلی پوسٹنگ ٹریفک ہائی ویز پنجاب میں بطور افسر شماریات ہوئی۔

چارج لینے پہنچی تو معلوم ہوا فضل محمود ڈی آئی جی ٹریفک ہیں۔

وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے اور اپنے دفتر میں بلا کر کچھ ہدایات دیں۔ جن میں ایک یہ تھی کہ کبھی کسی ماتحت کے ساتھ چائے نہ پی جائے۔

اس دفتر میں صرف تین آفیسر تھے۔ فضل محمود ڈی آئی جی، محبوب حسن مانیکا ڈی ایس پی ہیڈ کوارٹر، نیلما ناہید درانی ڈی ایس پی افسر شماریات، باقی تمام عملہ کلرک اور آفس اسسٹنٹ اور سپرنٹنڈنٹ پر مشتمل تھا۔

فضل محمود فجر کی نماز ادا کر کے آفس آ جاتے۔ ان کا آفس گیٹ کے بالکل سامنے تھا جس کا دروازہ کھلا ہوتا اور وہ ہر آنے جانے والے کو چیک کرتے۔

اس لیے نا تو کوئی ملازم دفتری اوقات سے لیٹ ہو سکتا تھا۔ نا وقت سے پہلے باہر جا سکتا تھا۔ کسی کے وزیٹرز آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

ان کا مزاج بہت سخت گیر تھا لیکن وہ نماز ظہر اور عصر باجماعت دفتر کے گیراج میں سارے عملہ کے ساتھ ادا کرتے۔ خود نماز مغرب تک دفتر میں رہتے۔

کبھی کبھی دفتر سائیکل پر سوار ہو کر آتے اور سائیکل پر ہی دفتر سے گھر جاتے۔ ڈرائیور خالی گاڑی لے کر سائیکل کے ساتھ ساتھ چلتا۔

لنچ ٹائم میں اکثر ان کا اردلی مجھے بلانے آتا۔ میز پر مکئی کے بھٹے رکھے ہوتے۔ ہم یہ چھلیاں کھا کر چائے پیتے یہ ہمارا لنچ ہوتا۔ اس دوران وہ مکئی کے فائدے بیان کرتے۔

مجھے تیز اور شوخ رنگ بہت پسند ہیں جو میرے لباس سے بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

فضل محمود کئی بار کہتے۔ اگر میں لڑکی ہوتا تو صرف سفید لباس پہننے کو ترجیح دیتا۔

میری سہولت کے لیے فضل محمود صاحب نے میری دو سہیلیوں جو سب انسپکٹرز تھیں۔ فرناز ملک اور شاہدہ کو بھی ٹریفک ہائی ویز میں بلا لیا۔ ان کے ذمہ قربان لائن میں واقع ٹریفک ٹریننگ سکول میں لیکچر دینا بھی تھا۔ فرناز اور شاہدہ ان دنوں گورنمنٹ لاء کالج میں شام کو پڑھنے بھی جاتی تھیں۔

فضل محمود کبھی کبھار ہم سب کو چائے کے لیے اپنے دفتر میں بلا لیتے اور پھر ترنگ میں آ کر اپنے کرکٹ کے زمانے کی داستانیں سنایا کرتے۔

برطانیہ کی شہزادی مارگریٹ اور بالی وڈ کی ہیروئن مالا سنہا ان کی مداح رہی تھیں۔ اور ایک میچ میں مالا سنہا کی خواہش پر انھوں نے تین وکٹ لی تھیں۔ لیکن اب ان کا ایک نیا روپ تھا۔ ان کا مذہب کی طرف رجحان ہو چکا تھا۔ طاہر القادری کے درس بھی سنتے اور دفتر میں باجماعت نماز بھی ادا کرتے۔

ان دنوں پنجاب کے گورنر جنرل غلام جیلانی تھے۔ فضل محمود ان کے بچوں کو کرکٹ سکھانے جاتے۔ ان کو ڈی آئی جی ٹریفک لگے پانچ سال ہو چکے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ وہ ریٹائرمنٹ تک اسی عہدے پر رہیں گے۔ فضل محمود کا تعلق اس پہلے گروپ سے تھا جس میں

قومی کھلاڑیوں کو پہلی بار پاکستان میں انسپکٹر سارجنٹ بھرتی کیا گیا تھا۔ ہاکی کے قومی کھلاڑی منیر ڈار اور ذکاء الدین بھی انسپکٹر سارجنٹ بھرتی ہوئے تھے۔

جس دن گورنر غلام جیلانی کا تبادلہ ہوا۔ فضل صاحب بہت افسردہ تھے۔ کچھ دنوں بعد ہی ان کا تبادلہ آئی جی پنجاب کے ساتھ سول سیکرٹریٹ میں کر دیا گیا اور اسد جہانگیر خان ڈی آئی جی ٹریفک پنجاب بن کر آ گئے۔

ان دنوں فضل محمود کی کتاب ''تلاش حق'' بھی چھپ چکی تھی۔ میری پہلی کتاب ''جب تک آنکھیں زندہ ہیں'' چھپی تو اس کی تقریب رونمائی فلیٹیز ہوٹل میں ہوئی۔ صدارت اشفاق احمد نے کی۔ اس وقت کے وفاقی وزیر اطلاعات چوہدری شجاعت حسین مہمان خصوصی تھے۔ نظامت دلدار بھٹی نے کی۔ میری درخواست پر فضل محمود بھی تشریف لائے۔

وہ اپنی ریٹائرمنٹ تک آئی جی دفتر میں ہی تعینات رہے۔ روزانہ اپنے گھر گڑھی شاہو سے سول سیکرٹریٹ تک باوردی سائیکل پر جاتے رہے۔

جب کبھی آئی جی آفس جانا ہوتا۔ منیر ڈار کے دفتر میں ان سے ملاقات ہو جاتی۔

کئی برس بعد الحمرا ہال میں مواحد حسین شاہ کے اعزاز میں تقریب تھی۔ فضل محمود اس تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ تقریب کے اختتام پر مواحد حسین شاہ نے مجھے کہا کہ آپ فضل محمود صاحب کو ان کے گھر تک چھوڑ دیں۔ میں نے فضل محمود کو گڑھی شاہو فضل سٹریٹ میں واقع ان کے گھر کے دروازے پر خدا حافظ کہا۔

یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔

پاکستان ٹیلی ویژن کا پہلا اناؤنسر: طارق عزیز

1964ء میں پاکستان میں دو ٹیلی ویژن اسٹیشن بنائے گئے۔ایک لاہور میں اور دوسرا مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے شہر ڈھاکہ میں۔
ٹیلی ویژن لاہور سنٹر جو ریڈیو پاکستان کے عقب میں ایک سٹوڈیو پر مشتمل تھا، کی نشریات کے آغاز کے لیے ریڈیو پاکستان لاہور کے نوجوان اناؤنسر طارق عزیز کی خدمات حاصل کی گئیں۔یوں ساہیوال سے ایف اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد حصول معاش کے لیے لاہور آنے والا طارق عزیز پاکستان ٹیلی ویژن کا پہلا مرد اناؤنسر بن گیا۔

کچھ ہی دنوں بعد کنول حمید کو بھی اناؤنسر منتخب کیا گیا۔وہ پاکستان ٹیلی ویژن کی پہلی خاتون اناؤنسر بنیں۔وہ ریڈیو آرٹسٹ موھنی حمید جو اپنے بچوں کے پروگرام سے آپا شمیم کے نام سے جانی جاتی تھیں کی صاحبزادی تھیں۔کنول حمید شادی کے بعد کنول نصیر ہوئیں۔انھوں نے ٹیلی ویژن کے مختلف پروگراموں میں حصہ لیا اور ڈراموں میں اداکاری بھی کی۔طارق عزیز اپنے ادبی ذوق وشوق اور اردو کی عمدہ ادائیگی اور گرجتی آواز کے باعث ایک الگ شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اردو دان طبقہ کا قبضہ تھا اور پنجابی بہت

مشکل سے ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے آڈیشن ٹیسٹ میں کامیاب ہوتے تھے۔

طارق عزیز 1936ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ 1947ء میں والدین کے ساتھ ہجرت کر کے ساہیوال میں مقیم ہوئے۔ ان کے والد اپنا نام عبدالعزیز پاکستانی لکھتے تھے۔

طارق عزیز نے اپنا مقبول ترین شو ''نیلام گھر'' 1975ء میں شروع کیا۔ اس پروگرام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی نقل میں بہت سے ٹی وی چینل اس طرح کے پروگرام کر رہے ہیں لیکن ان میں خوش ذوقی اور ادبی رنگ دکھائی نہیں دیتا۔

نیلام گھر میں ان کے ساتھ معاون کے طور پر سٹیج پر کھڑی ہونے والی خواتین میں سے کئی نے بعد میں شوبز میں شہرت پائی۔ جن میں ارم حسن اور ثمینہ پیرزادہ شامل ہیں۔ نیلام گھر کو طارق عزیز کی پیپلز پارٹی سے وابستگی کی وجہ سے ضیاالحق دور میں بند کر دیا گیا لیکن دلدار بھٹی کے ٹاکرہ کی طرح انھوں نے بھی بیگم ضیاالحق کی سفارش پر اپنا پروگرام بحال کروا لیا۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی سیاسی وابستگی بھی بدل لی۔

1992ء میں ان کو تمغہ حسن کارکردگی دیا گیا اور 1997ء میں وہ مسلم لیگ کی ٹکٹ پر ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔

طارق عزیز نے پنجابی زبان میں شاعری بھی کی۔ وہ منیر نیازی سے متاثر تھے۔ پنجابی نظموں پر مشتمل ان کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ شعر و ادب سے والہانہ لگاؤ کی وجہ سے ان کو اردو اساتذہ شعرا کے ہزاروں شعر زبانی یاد تھے۔ جنہیں وہ اکثر پروگرام کے دوران سنایا کرتے تھے۔

چند برس پہلے ان کی خواہش پر ''نیلام گھر'' کا نام تبدیل کر کے ''طارق عزیز شو'' کر دیا گیا۔ پہلے ادوار میں طارق عزیز شو کی ریکارڈنگ پی ٹی وی لاہور سنٹر کے سٹوڈیو اے میں ہوا کرتی تھی۔

پھر اس کو الحمرا ہال 2 اور پھر محفل حال ایبٹ روڈ پر منتقل کر دیا گیا۔

بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود طارق عزیز کی آواز گرج اور سوال پوچھنے کے لیے سرعت سے سیڑھیاں چڑھنے کا انداز آخر دم تک قائم رہا۔ مجھے طارق عزیز شو میں طلبا و طالبات کے بیت بازی کے مقابلوں میں بطور جج شرکت کا کئی بار موقع ملا اور ہر بار انھوں نے اصرار کر کے ہمیں اپنا کلام سنانے کا کہا۔ آخری بار جب میں نے طارق عزیز شو میں شرکت کی تو اپنی ایک غزل ان کی نذر کی۔

زندگی رات تھی گزر ہی گئی
اک عجب بات تھی گزر ہی گئی
جو مسافت تھی سب تمام ہوئی
کیسی برسات تھی گزر ہی گئی

خبر نہ تھی کہ عنقریب ان کی زندگی کی رات ختم ہونے والی ہے۔ وہ ٹویٹر پر بھی تھے۔ آج کل روزانہ اسلامی اور اصلاحی ٹویٹس کر رہے تھے۔

کچھ دن پہلے ٹویٹ کی کہ ان کی خودنوشت ''فٹ پاتھ سے پارلیمنٹ تک'' چھپ چکی ہے کچھ دن تک مارکیٹ میں آجائے گی۔

طارق عزیز نے پشاور کی ایک لیڈی ڈاکٹر سے شادی کی جو نواز دور میں ممبر پارلیمنٹ بھی بنیں۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

جس پر طارق عزیز نے چند دن پہلے اپنی جائیداد بعد از مرگ حکومت پاکستان کو دینے کی وصیت کی ہے۔

45 برس تک دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں کو پکارنے والی آواز آج خاموش ہو گئی ہے۔

ادب لطیف کی صدیقہ بیگم

بہت سال پہلے ماہنامہ تخلیق کے دفتر میں اظہر جاوید نے ایک سانولی سلونی دراز قد باوقار خاتون کا تعارف کرواتے ہوئے کہا ''یہ صدیقہ بیگم ہیں، حنیف رامے کی کزن اور ''ادب لطیف'' کی مدیرہ۔

ادب لطیف صدیقہ بیگم کے والد چوہدری برکت علی نے جاری کیا تھا۔ اس کی ادارت کی ذمہ داریاں ہمیشہ نامور ادیبوں شاعروں کے حصہ میں آئیں۔ جن میں مرزا ادیب، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، کنہیا لال کپور، شاہد بخاری اور ظفر معین بلے کے نام شامل ہیں۔

اپنے والد کی وفات کے بعد صدیقہ بیگم ''ادب لطیف'' بڑی باقاعدگی سے ہر ماہ شائع کرواتی تھیں اور اس کے لیے ہمیشہ کسی نا کسی شاعر کی خدمات حاصل کرتیں۔ ظفر معین بلے نے دس برس تک ادب لطیف کی ادارت کا منصب سنبھالا۔ زیادہ عرصہ سینئر شاعر ناصر زیدی کو یہ ذمہ داری سنبھالنے کا موقع ملا۔

اس کے بعد تخلیق کی ہر تقریب میں ان سے ملاقات ہونے لگی جو اکثر مال روڈ پر واقع شیزان ہوٹل میں ہوا کرتی تھیں۔

1994ء میں فخر زمان نے اکادمی ادبیات اسلام آباد میں آل پاکستان کانفرنس

کروائی تو صدیقہ بیگم کے کئی طنز و مزاح سے بھر پور جملے بھی سننے کو ملتے رہے۔ مجھے دیکھ کر کہتیں ''لگتا ہے نیلما اپنے جہیز کے کپڑے پہن رہی ہے''

مجھے ان کی اس بات میں بھی ان کی شفقت اور اپنائیت دکھائی دیتی تھی۔

ایک روز ان کو الحمرا ہال میں سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا۔ ان کے گھنے بال جن کا وہ اکثر جوڑا بنا کر رکھتی تھیں۔ سفید دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے کہا ''اب میں ستر سال کی ہو چکی ہوں۔ اس لیے بال رنگنا چھوڑ دیے ہیں''۔ سفید بالوں نے ان کو زیادہ پروقار بنا دیا تھا۔

اچھی کتب کا مطالعہ اور سیر و سیاحت ان کے محبوب مشاغل تھے۔ الیاس گھمن نے لندن میں مقیم وینا ورما کی پنجابی کہانیوں کی کتاب ''مل دی تینوں'' کی تقریب رونمائی کروائی۔ جس میں بی بی سی لندن کی ارجمند بھی تھیں۔ صدیقہ بیگم کو میں نے ارجمند سے متعارف کروایا۔ دونوں میں کچھ چیزیں مشترک تھیں اس لیے ان کی خوب دوستی ہوگئی۔

اشفاق احمد کی وفات پر ان کو بانو قدسیہ کو حوصلہ دیتے ہوئے دیکھا۔

جب فیس بک جوائن کیا تو صدیقہ بیگم کو یہاں بھی متحرک پایا۔ وہ روزانہ اس کتاب کا ذکر کرتیں جو ان کے زیر مطالعہ ہوتی۔ اپنی طبیعت کے بارے میں بھی آگاہ کرتی رہتیں۔ گرمیوں میں لندن اور سردیوں میں دبئی جانے لگیں۔

میں 2009ء سے 2011ء تک سوڈان اور پھر اپنی والدہ کی علالت کی وجہ سے پاکستان سے باہر رہی۔ دسمبر 2013ء میں والدہ کی وفات کے بعد پاکستان آئی تو 2014ء میں صدیقہ بیگم نے میرے اعزاز میں جم خانہ کلب میں ظہرانے کی دعوت رکھی جس میں انھوں نے اپنے کچھ قریبی دوستوں کو بھی بلایا۔

پروین عاطف بھی وہاں موجود تھیں۔ یہ میری صدیقہ بیگم اور پروین عاطف کے

ساتھ آخری ملاقات تھی۔

فیس بک پر ان سے رابطہ رہا۔ ان کے داماد انیس احمد خان جو اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے بیٹے تھے، کی وفات نے ان کو بہت غمگین کر دیا تھا جوان بیٹی کی بیوگی کا دکھ صدیقہ بیگم جیسی بلند حوصلہ اور بہادر خاتون کو دیمک کی طرح چاٹ گیا اور پھر اچانک ان ہی کے فیس بک کے ذریعے یہ خبر ملی کہ وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آخری لمحوں میں بھی کوئی کتاب ان کے سرہانے پڑی ہو گی۔ اور اب وہ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ سے مل کر اس پر تبصرہ کر رہی ہوں گی۔

صبیحہ خانم

(50اور60 کی دھائی میں پاکستان فلم انڈسٹری کی مقبول ترین ہیروئن)

میرے ایک پھوپھا نے ننکانہ صاحب میں ایک عارضی سینما بنایا تھا۔ وہ لیہ کے رہنے والے تھے۔ جہاں ان کے والد ڈاکٹر تھے۔ بہت ساری زمینیں تھیں۔ پتہ نہیں ان کو یہ خیال کیسے آیا کہ لیہ سے چل کر اپنا سینما ننکانہ صاحب لے آئے۔

ہمارے والدین بھی کچھ دنوں کے لیے انھیں ملنے گئے۔ روزانہ شام کو سب گھر والے فلم دیکھنے جاتے۔ بڑوں کے لیے کرسیاں اور بچوں کے لیے چارپائیاں بھی ساتھ جاتیں۔ خواتین اور بچوں کے لئے الگ حصہ مخصوص تھا۔ جہاں وہ کرسیاں اور چارپائیاں بچھادی جاتیں۔ فلم شروع ہونے سے پہلے ہی ہم بہن بھائی اور کزنز ان چارپائیوں پر سوچکے ہوتے تھے کہ اچانک شور سے آنکھ کھل جاتی۔

اس وقت سکرین پر ایک خوبصورت اداکارہ رقص کر رہی ہوتی۔ جسے دیکھ کر ننکانہ صاحب کے رہائشی شائقین جوش میں آکر شور مچا رہے ہوتے۔ کئی بار وہ بوتلوں کے ڈھکن بھی جیبوں میں ڈال کر لاتے اور گانا شروع ہوتے ہی وہ ڈھکن سکرین پر پھینکنے لگتے۔ اس فلم کا نام مکھڑا تھا اور اس اداکارہ کا نام صبیحہ خانم تھا۔

یہ سین چونکہ دس دن تک مسلسل دیکھا اس لیے حافظے میں محفوظ ہوگیا اور گانوں

کے بول بھی کانوں میں گونجتے رہے۔

میں اڈی اڈی جانواں ہوا دے نال

بدل نوں ہتھ لاواں ہوا دے نال

یا پھر

دِلا ٹھہر جا یار دا نظارا لین دے

کوئی دل دی سجناں نوں گل کہن دے

اس واقعے کو برسوں بیت گئے۔ میرا لاہور کالج میں داخلہ ہوا تو میری سکول کی دوست صوفیہ اپوا کالج میں داخل ہوئی۔ اپوا کالج اور لاہور کالج کے درمیان شادمان چوک کا فاصلہ تھا۔

روزانہ صوفیہ سے ملنے اپوا کالج جانا ہوتا تھا۔ صوفیہ کی ایک کلاس فیلو پرملا پروین تھی۔ پرملا پروین نے بتایا وہ کالج ٹائم کے بعد صبیحہ خانم کی بوتیک پر کام کرتی ہے۔ یہ بوتیک شاہ جمال کالونی لاہور میں صبیحہ خانم نے اپنے گھر کے گیراج میں بنا رکھی تھی۔

ایک دن میں اپنی امی کے ساتھ اس بوتیک پر گئی۔ کیونکہ صبیحہ خانم میری امی کی پسندیدہ اداکارہ تھیں۔ وہ بوتیک پر خود موجود تھیں اور مختلف کرتے دکھا کر ہمیں خریدنے پر مائل کر رہی تھیں۔ میں نے ان سے ایک گولڈن کلر کا کرتہ خریدا۔ اسی دوران اداکارہ شمیم آرا بھی وہاں آ گئیں۔ ان کے ریشمی لمبے بال ان کی کمر تک لہرا رہے تھے۔ وہ دونوں آپس میں گفتگو میں مصروف ہو گئیں۔ ہم نے پرمیلا کو کرتے کی قیمت ادا کر کے۔ ان سے اجازت چاہی۔ یہ میری صبیحہ خانم سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

ایک زمانے میں اس گھرانے کا فلم انڈسٹری پر راج تھا۔ سنتوش کمار صبیحہ خانم کی جوڑی۔ درپن اور نیر سلطانہ کی جوڑی۔ ہدایت کار سلیمان اور زرین پنا کی جوڑی۔

ایک ہی گھر کے یہ سب فنکار نہ صرف اپنے اپنے فن میں یکتا تھے بلکہ حسن و خوبصورتی میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ جب ان کے عروج پر زوال شروع ہوا۔ تو ان باہمت خواتین نے ہمت نہ ہاری۔ سنتوش کمار فلموں سے دور ہو گئے مگر صبیحہ خانم دیر تک فلموں میں مختلف کردار ادا کرتی رہیں اور اپنے گھر کی معیشت کو سنبھالنے کے لیے بوتیک کا کاروبار بھی کیا۔

نیر سلطانہ نے بھی درپن کو تا دیر سہارا دیا لیکن وہ دونوں جلدی اس جہان سے رخصت ہو گئے۔ سنتوش کمار اور ان کی پہلی بیوی جمیلہ بھی اگلے جہان سدھار گئے۔ ایس سلیمان جو فلمی ہدایت کار تھے برسوں سے علیل ہیں۔ ذریں پنا ابھی تک اپنی ہمت سے مختلف اداروں میں کام کر رہی ہیں۔

آج صبیحہ خانم کے بارے میں خبر آئی ہے کہ انھوں نے امریکہ کے ہسپتال میں آخری سانس لیے ہیں۔

پاکستانی فلم انڈسٹری کے اوائل میں انڈسٹری کو سہارا دینے والا اور ایک عرصہ تک پردہ سکرین پر راج کرنے والا یہ خاندان کیسی کیسی مالی مشکلات کا شکار رہا لیکن کسی حکومت نے کبھی فنکاروں کی بہبود کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔

صبیحہ خانم نے اپنے آخری ایام دیارِ غیر میں کیسے گزارے کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔

دو برس پہلے علی اعجاز نہایت کسمپرسی کی حالت میں لاہور میں اس دیارِ فانی سے رخصت ہوئے تھے۔

دیارِ غیر میں صبیحہ خانم کی وفات ایک لمحہ فکریہ ہے۔ کیا کبھی ہم فنونِ لطیفہ سے وابستہ لوگوں کو ان کی زندگیوں میں آسانی دینے کے لیے کوئی اقدام کر سکیں گے۔

مزاحیہ اداکاری کا بے تاج بادشاہ......امان اللہ

بہت دنوں کی بات ہے جب اکثر اداکاری کے شوقین لاہور میں پاکستان کے واحد ٹیلی ویژن سنٹر کی عمارت کے باہر کھڑے ہو کر اس عمارت میں داخل ہونے کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے۔

انہی میں ایک دبلا پتلا نوجوان بھی اپنی قسمت آزمانے وہاں جاتا۔اس امید پر کہ کبھی اس کو اس عمارت میں داخل ہونے کا موقع مل جائے۔

اس کی شکل وصورت بھی واجبی سی تھی اور تعلیم یافتہ بھی نہیں تھا۔جبکہ اس انتظار کی لائن میں کئی ہیرو نما تعلیم یافتہ لڑکے بھی کھڑے ہوتے کہ شاید کبھی کسی پروڈیوسر کی نظر کرم ان پر پڑ جائے۔

امان اللہ روز آتا۔اس کی صرف یہ خواہش تھی کہ ایک بار مشہور پنجابی پروگرام ٹاکرا کے میزبان دلدار بھٹی سے ملاقات ہو جائے۔

پھر ایک روز اس نے ٹی وی کے گیٹ پر ہی دلدار بھٹی کو روک کر کہا کہ مجھے بس ایک بار اپنے پروگرام میں پرفارمنس دکھانے کا موقع دیں۔

اگر پسند نہ آیا تو پھر کبھی نہیں آؤں گا۔دلدار بھٹی اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹی وی کی عمارت میں لے گیا اور کہا اب اپنا فن دکھاؤ۔امان اللہ نے جب اپنی اداکاری شروع

کی توسب اس کا فن دیکھ کر حیران رہ گئے۔

ٹاکرہ پروگرام امان اللہ کے لیے پہلا ٹی وی پروگرام تھا لیکن ان دنوں پی ٹی وی پر پنجابی مزاحیہ پروگرام شجر ممنوعہ کی طرح تھے۔ لہٰذا اس کو اپنی صلاحیتیں منوانے کے لیے سٹیج کا رخ کرنا پڑا اور پھر ایک طویل مدت تک سٹیج کی دنیا کا بے تاج بادشاہ رہا۔

اس دوران بہت سے نئے فنکار آئے مگر کوئی بھی اس کا مقابلہ نا کر سکا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے دولت اور شہرت اکٹھی کی مگر نا تو اس کا حلیہ بدلا اور نا ہی اس کے مزاج کی انکساری میں کوئی فرق آیا۔ اس نے اپنے بہت سارے عزیز و اقارب کی کفالت کا ذمہ بھی لے لیا۔ طارق جاوید اور امان اللہ کی جوڑی ہر ڈرامے کی کامیابی کی ضمانت ہوتی۔ کوئی بھی سٹیج والا ہال ہو کھچا کھچ بھر جاتا۔

ان دنوں سٹیج ڈراموں میں نا تو ڈانس ہوتا تھا نا ہی بے ہودہ جملہ بازی...... پھر بھی لوگ صرف امان اللہ کی پرفارمنس دیکھنے آتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ سٹیج کا مزاج تبدیل ہوتا گیا۔ رقص وسرود نے شائقین کا مزاج بدلا تو سٹیج ڈراموں میں خواتین کی تعداد زیادہ ہوگئی۔ سنجیدہ اداکار سٹیج سے دور ہونے لگے۔ کچھ عرصہ کے لیے امان اللہ بھی شوبز کی دنیا سے دور ہو گئے۔ وہ فنکار جس کی روزی روٹی کا انحصار ہی اس کی پرفارمنس پر ہو۔ اور اس کے ذمہ کئی خاندانوں کی کفالت بھی ہو اس نے یہ وقت نا جانے کیسے گزارا ہوگا۔

کچھ سال پہلے میں دس محرم کی شام کربلا گامے شاہ کے باہر ڈیوٹی پر کھڑی تھی۔ امان اللہ اپنے بچوں اور خواتین کے ساتھ اندر جا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر پوچھا: ''آپ نے مجھے پہچانا......؟'' میں نے کہا ''بھائی آپ کو کون نہیں پہچانتا؟'' یہ سن کر اُن کی آنکھوں میں اداسی بھری چمک اُبھری۔ وہ اپنے بچوں کو بتانے لگے کہ یہ بہت بڑی پولیس آفیسر ہیں (میں یونیفارم میں نہیں تھی)۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔

جب نئے ٹی وی چینلز شروع ہوئے تو ان کو بہت سے پروگراموں میں دوبارہ دیکھا۔ جن میں آفتاب اقبال کے شوز تھے۔ اچھا لگا کہ بھولے بسرے فنکاروں کی روزی روٹی کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ مگر اپنی جان لیوا بیماری کے باعث وہ اسے زیادہ دیر جاری نہ رکھ سکے اور 6 مارچ 2020ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مجھے یقین ہے کہ فرشتے بھی ان کی جگت بازی سے محظوظ ہو رہے ہوں گے۔

داستان ایک سفر کی......

26 اکتوبر 2019ء کی صبح ایک مختصر قافلہ لاہور سے حافظ آباد کی طرف روانہ ہوا۔ پروین سجل، آسناتھ کنول، نسیم شیخ، سخاوت علی نادر، شائق شہاب اور نیلما درانی اس قافلے میں شامل تھے۔ اس سفر کا اہتمام اکادمی ادب پاکستان کے عرفان خانی نے کیا تھا جو شریک قافلہ بھی تھے۔

دوپہر کو حافظ آباد پہنچے۔ یہاں سید محمود بسمل اور شاہ دل شمس بھی اس قافلے میں شامل ہو گئے۔ اب اگلی منزل ونی نام کے ایک قصبہ کا ہائی سکول تھا۔

دورویہ ہریالے کھیتوں سے سجی سڑکوں سے گزرتے ہوئے جب ہم سکول کی عمارت میں داخل ہوئے تو بچوں کے بینڈ نے ہمارا استقبال کیا۔ سکول کے پرنسپل اور اساتذہ کے ہمراہ علاقے کے معززین بھی موجود تھے۔ جنہوں نے مہمانوں کو پھولوں کے ہار پہنائے۔ سکول کی عمارت کئی ایکڑ پر مشتمل تھی۔ وسیع ہال میں طالب علموں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ انھوں نے بھرپور تالیوں سے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔

ایک بھرپور اور خوبصورت محفل مشاعرہ کئی گھنٹوں تک جاری رہی۔ رات کے کھانے کا اہتمام سکول کی لائبریری میں کیا گیا تھا جسے سکول کے پرنسپل نے اپنے ذاتی خرچ پر تعمیر کروایا تھا۔ سکول کی دیواروں پر ہر جگہ علامہ اقبال کے اشعار اور

خوبصورت اقوال درج تھے جو پرنسپل کی ادب دوستی کی دلیل تھے۔

ہماری اگلی منزل کلر کہار تھی۔ کلر کہار پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ دوسرے روز مشاعرہ تھا۔ لہٰذا ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

27 اکتوبر کی صبح ناشتے کی میز پر کلر کہار کے صحافی شاعر صفی الدین صفی سے ملاقات ہوئی۔ عرفان خانی مشاعرے کے انتظام میں مصروف تھے۔ اس لیے ہم نے صفی الدین صفی سے کلر کہار دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

ان کے وکیل بیٹے نے کار ڈرائیو کی اور ہم کلر کہار کی جھیل کنارے پہنچ گئے...... تصاویر بنائیں۔

اگلی منزل تخت بابری تھا۔ مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے لیے پہاڑ کے اوپر ایک چٹان کو ہموار کیا گیا تھا۔ جہاں بیٹھ کر وہ اپنی افواج کے ساتھ خطاب کیا کرتے تھے۔ بابر نے کلر کہار کو اپنی کتاب ''تزک بابری'' میں ''بچہ کشمیر'' لکھا ہے۔

کلر کہار کی وادی اپنے خوبصورت موروں کے لیے مشہور ہے لیکن ہمیں مور کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ صفی الدین صفی ایک اچھے گائیڈ کی طرح سب جگہوں کا تعارف کروا رہے تھے۔

آشیانہ ریسٹ ہاؤس وہ جگہ تھی جہاں پاکستان کے تمام سربراہ ٹھہرتے رہے ہیں۔ خصوصی طور پر بے نظیر بھٹو یہاں کئی بار ٹھہری تھیں۔ وہاں وہ کرسی بھی موجود تھی۔ جس پر بیٹھ کر وہ اپنی کابینہ اور پارٹی عہدہ داروں سے میٹنگ کیا کرتی تھیں۔ ہم سب نے اس کرسی پر بیٹھ کر تصاویر بنوائیں۔

باہر نکلے تو احاطہ میں چند مور دکھائی دیئے۔ ان کی کچھ تصاویر بنا رہے تھے۔ عرفان خانی کا فون آیا۔ ظہرانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اس لیے واپس ہوٹل جانا پڑا۔

شام کو میری صدارت میں مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ شاعروں کو

اچھے شعر پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر کے داد دی جا رہی تھی۔ گلابوں اور شعروں سے مہکتی یہ محفل دیر تک جاری رہی لیکن حاضرین کا جوش و خروش آخر تک دیدنی تھا۔ اس محفل میں فیصل آباد سے ریحانہ کنول، اسلام آباد سے فرحین چوہدری، کراچی سے شیخ نسیم، سخاوت علی نادر، شائق شہاب، حافظ آباد سے شاہ دل شمس، کلر کہار سے صفی الدین صفی اور بہت سے شعرا نے شرکت کی۔

مانچسٹر سے آنے والی شاعرہ ناہید کیانی مہمان اعزاز تھیں۔

مشاعرے کے بعد پروین سجل کی خواہش پر ہم کلر کہار میں واقع مزار ''ھو باھو'' گئے، فاتحہ خوانی کی۔ سب بازار بند ہو چکے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ جلد ہوٹل واپس آ گئے۔

28 اکتوبر گوجرانوالہ روانہ ہوئے۔ ریڈ نیوز پر ایک بھرپور مشاعرے کی ریکارڈنگ ہوئی۔ جس کی نظامت سینئر استاد شاعر جان کاشمیری نے بہت عمدگی سے کی۔ مشاعرے کے دوران عمران اعظم رضا بھی ریڈ نیوز کے سٹوڈیو میں آ گئے۔ وہ اپنے دفتر سے مجھے ملنے آئے تھے۔ انھیں جلدی واپس جانا تھا۔

مشاعرے کے بعد جان کاشمیری کی طرف سے عشائیہ کا انتظام بھی تھا۔

عرفان خانی نے اپنے گھر کلر کہار واپس جانا تھا۔ شاہ دل شمس اور سید محمود بسمل نے حافظ آباد روانہ ہونا تھا۔ ریحانہ کنول کو فیصل آباد جانا تھا۔

گوجرانوالہ وہ سنگم تھا جہاں پہنچ کر تین روزہ سفر میں ساتھ رہنے والوں کی راہیں جدا ہو رہی تھیں۔ کراچی والے لاہور واپس آ رہے تھے۔ ہم نے کسی کو خدا حافظ نہیں کہا اور لاہور والی بس پر سوار ہو گئے۔

اکادمی ادب پاکستان کی سجائی محفلوں کا تین روزہ پروگرام ختم ہو گیا تھا۔ اللہ کرے یہ سفر ہمیشہ اسی آب و تاب سے جاری رہے۔

مانچسٹر UK میں چار دن

جنوری 2020ء سردی کی دھوپ میں نکھرا ہوا خوبصورت دن تھا۔ منان قدیر منان اور طیب رضا بٹ کے ہمراہ لندن سے مانچسٹر کی طرف M 25 سے رواں دواں تھے۔

پاک برٹش آرٹس کے چیئرمین یونس امین شیخ نے مانچسٹر میں میرے اعزاز میں ایک شعری محفل کا اہتمام کیا تھا۔ اتنی دور جانے کا حوصلہ تو نہیں تھا مگر منان قدیر منان نے حوصلہ بڑھایا کہ وہ نہ صرف مانچسٹر لے کر جائے گا بلکہ واپس بھی گھر تک پہنچائے گا۔

سردی کی خوبصورت دوپہر آہستہ آہستہ شام میں ڈھل رہی تھی۔ دوران سفر بھی شاعری کا دور چل رہا تھا۔ نوجوان شاعر طیب رضا بٹ نے بہت خوبصورت پنجابی کی نظمیں سنائیں۔

منان قدیر منان نے اپنی کتاب عنایت کی جو برطانیہ میں مقیم شاعروں کی شاعری کا انتخاب ہے اور تقریباً تمام شعرا اور شاعرات کی تین تین غزلیں شامل کی گئی ہیں۔

کچھ دیر کتاب کے صفحے الٹ پلٹ کیے یقیناً یہ منان قدیر منان کی ایک اچھی

کاوش ہے۔ایسا انتخاب اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے یہ اعتراض تھا کہ اس میں برمنگھم میں رہنے والی باجی نسیم اختر کا کلام شامل نہیں ہے۔جس کا جواب یہ ملا کہ یہ دور حاضر کے تمام زندہ شاعروں کا کلام ہے۔اس میں مرحومین کا کلام شامل نہیں کیا گیا۔

شام کے ٹھیک چھ بجے،ہم مانچسٹر کے''لاہور کڑاھی'' کے ہال میں پہنچ چکے تھے جہاں یونس امین شیخ اپنی ساری ٹیم کے ساتھ موجود تھے۔

احمد شہزاد مسقط سے تشریف لائے تھے وہ اس تقریب کے مہمان اعزاز تھے۔

ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔کرسیاں کم ہونے کے باعث کچھ افراد کھڑے ہوئے تھے۔سات بجے میری صدارت میں مشاعرے کا آغاز ہوا۔تلاوت کا شرف شیخ الیاس امین نے حاصل کیا۔نعتیہ دعا محمد سرور نے نہایت خوبصورت انداز وآواز میں پڑھی۔

نظامت منان قدیر منان کر رہے تھے۔وہ ہر شاعر کو بلانے سے پہلے مختلف شعرا کے شعر بھی سنا رہے تھے۔

سات بجے شروع ہونے والی محفل مشاعرہ رات دس بجے تک جاری رہی۔

مقامی شعرا میں جن شعرا نے کلام پڑھا ان میں ضمیر جاوید،غلام رسول شہزاد، لیاقت علی عہد،سید علی شان،سرفراز طالب سیال،شائق نصیر پوری،طیب رضا بٹ، شارق خان،احمد نظامی،ڈاکٹر یونس امین شیخ،لیسٹر شائر سے سرفراز تبسم اور لندن سے تشریف لائے رانا ساجد محمود شامل تھے۔آخر میں مشاعرے کے مہمانِ خصوصی احمد شہزاد نے اپنی نظمیں اور اشعار پیش کئے جسے حاضرین نے خوب سراہا۔میرے حصہ میں صدارتی خطبہ بھی تھا۔اور کچھ فرمائشی کلام بھی۔سامعین کا ذوق وشوق محفل کے آخر تک برقرار رہا۔

رات کے کھانے کے بعد گیت سنگیت کی محفل شروع ہوئی۔

شمشاد گل نے کشور کمار اور مکیش کے نغمے گا کر پرانے گیتوں کا سحر طاری کر دیا۔
اس خوبصورت محفل کا اختتام ہوا تو رات کے دو بج چکے تھے۔
سب اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ مانچسٹر میں میری میزبان ایک قازقستان کی خاتون تھی جو بہت خوبصورت اردو بولتی تھی۔ اس نے اپنے گھر کا ایک کمرہ میرے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ سفر کی تکان کے باعث جلد نیند آ گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو دن کے بارہ بج رہے تھے۔
قازقستان والی خاتون اور اس کی پریوں جیسی پیاری بیٹی جس کو وہ شہزادی پکار رہی تھی۔ اور وہ سچ مچ کی پریوں کی شہزادی ہی تو تھی۔
ان کے ساتھ مل کر ناشتہ کیا۔ کچھ دیر بعد شیخ یونس آمین اور شیخ الیاس امین آ گئے انھوں نے بتایا کہ ''پی بی اے بیٹھک'' کے پروگرام کی ریکارڈنگ ہے جس کا موضوع تھا ''ادیبوں اور شاعروں کے رویے''۔
صحافی اور KTV کے انچارج طارق لودھی کے دفتر پہنچے۔ منان قدیر منان اور احمد شہزاد پہلے سے موجود تھے۔
پروگرام کی ریکارڈنگ کے بعد لاہوری نظارہ سے لنچ کیا گیا۔
منان قدیر منان اور احمد شہزاد کو رخصت کیا۔
طارق لودھی کے آفس دوبارہ آئے۔ پروگرام کی ایڈیٹنگ کرواتے ہوئے رات کے نو بج گئے۔
مانچسٹر کی مشہور wilmslow road پہنچے۔ کچھ تصاویر بنائیں۔ یہاں زیادہ شیشہ کیفے ہیں جو پاکستانی قومی کرکٹ ٹیم کی وجہ سے عالمی شہرت پا چکے ہیں۔
ایک افغانی ریستوران سے کھانا لیا جو گھر پہنچ کر اپنی میزبان خاتون کے ساتھ مل کر کھایا۔

یونس امین شیخ نے بتایا۔ پیر کو اہلبیت ٹی وی کے پروگرام کی ریکارڈنگ ہے۔ اس کے بعد آپ واپس لندن جائیں۔

رات کو قازقستانی خاتون سے گپ شپ رہی۔ وہ بہت اچھی میزبان تھیں۔ کھانا اور پاکستانی چائے بھی اچھی بناتی تھیں۔

اتوار کے دن پروگرام بنا کہ ان کے ساتھ کسی شاپنگ مال جائیں۔

صبح اٹھے تو بارش ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش میں بھیگتے مال کی طرف روانہ ہوئے۔ سردی بھی بہت بڑھ چکی تھی۔ مال کے قریب پہنچے تو بارش تیز ہو گئی۔ ہم جلدی سے قریبی دکان میں داخل ہو گئے جو پرائمارک ہی تھی۔ کچھ چیزیں خریدیں۔

کچھ اور دکانیں دیکھیں۔ پریوں جیسی بچی تھک چکی تھی۔ اسے سردی بھی لگ رہی تھی۔ میں نے اپنی شال اس کو اوڑھا دی۔

گھر آ کر کھانا کھایا، چائے پی۔ یونس امین شیخ نے کہا آج رات کا کھانا ان کے بیوی بچوں کے ساتھ ہے۔

ہم پہلے ان کے سب سے چھوٹے بھائی فیصل امین شیخ کے گھر گئے۔ جہاں ان کے والد رہتے ہیں۔ تینوں بھائی اپنے والد کی خدمت کرتے ہیں۔ اتنے ہونہار اور سعادت مند بیٹے اللہ نصیب والوں کو ہی عطا کرتا ہے۔

ان کے والد نہایت خوش مزاج اور اچھی شخصیت کے مالک ہیں ان کی نیکی نور بن کر ان کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

شیخ یونس امین کے گھر پہنچے۔ ان کی بیگم جو نہایت نفیس خاتون ہیں، بہت خوش دلی سے ملیں۔ ان کے دو پیارے پیارے ہونہار بیٹے نواب اور میکائیل سے گپ شپ ہوئی۔ یہ بچے سکول میں ہمیشہ نمایاں پوزیشن حاصل کرتے ہیں اور یونس امین شیخ کی بیگم بچوں کو خود گھر پر پڑھاتی ہیں۔ بچے دینی تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں۔

ان کے ساتھ اباسین ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھایا۔

پیر کے دن شام کو wilmslow street گئے۔ آئس کریم کھائی۔ اہلبیت ٹی وی کے سٹوڈیو پہنچے۔ شاہین بٹ کی میزبانی میں پروگرام ''ساڈا پنجاب'' کی ریکارڈنگ ہوئی۔ شاہین بٹ لاہور اور امرتسر کی محبت میں سرشار ہیں۔ پنجاب اور پنجابی سے ان کی محبت ہے جس کے لیے وہ ساڈا پنجاب کے نام سے اہلبیت ٹی وی سے ہفتہ وار پروگرام کرتے ہیں۔ رات کا کھانا لاہوری نظارہ سے پیک کروا کر گھر گئے۔ سب نے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ قازقستانی خاتون، اس کی بچی، الیاس امین، یونس امین اور میں۔

منگل کی صبح پری مجھے جگانے آئی وہ سکول جانے سے پہلے مجھے الوداع کہہ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ آج برف پڑے گی۔

میں نے اس کو الوداع کہا۔ مجھے لندن کے لیے روانہ ہونا تھا۔ تین دن میں ہی یہ لوگ دل میں بس گئے تھے۔ جیسے پرانی شناسائی ہو۔ ہم صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ وہ گھر سے نکل کر سکول کی طرف روانہ ہوئی تو سفید روئی کے گالے ہوا میں تیرنے لگے۔

برمنگھم کی ایک مہکتی شام

گلناز کوثر کا فون آیا۔ برمنگھم پوئٹس نے 2 فروری 2020ء کو میرے اعزاز میں ایک شام کا اہتمام کیا ہے جس کے لیے وہ مجھے مدعو کر رہی تھی۔

''میں کیسے آؤں گی؟''

تنہا سفر کا خوف...... کیسی عجیب بات ہے۔ دنیا اور زندگی کا سارا سفر تنہا گزار کر بھی مجھے راستوں سے، فاصلوں سے اور شام کے دھندلکوں سے خوف آتا ہے۔

''میں نے منان قدیر منان کو کہہ دیا ہے وہ آپ کو لے آئے گا''۔ گلناز نے پورا انتظام کر رکھا تھا۔

منان قدیر منان کے ساتھ میں مانچسٹر کا سفر کر چکی تھی۔ وہ ایک خوبصورت شاعر، ماہر ڈرائیور اور اچھا ہم سفر ہے جو اپنی باتوں اور اشعار سے سفر کو خوشگوار بنانے کا فن جانتا ہے۔

گلناز کے فوراً بعد منان قدیر منان کی کال آ گئی ''آپا ایک بجے تک تیار رہیں میں آپ کو گھر سے پک کر لوں گا''۔

لندن سے دو گھنٹے کی مسافت کے بعد برمنگھم پہنچے تو سرمئی شام اتر چکی تھی۔ سردیوں میں شام بھی جلدی شروع ہو جاتی ہے۔ سڑکوں کے اطراف میں دکانیں ابھی

کھلی تھیں۔دیسی ملبوسات سجے دیکھ کر اپنائیت کا احساس ہوا۔یہ پاکستانی اکثریت کا علاقہ تھا۔ہر طرف اپنائیت کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔جس ریسٹورنٹ میں تقریب تھی وہ بھی پاکستانی تھا۔داخل ہوئے تو گلناز کوثر سامنے کھڑی تھی۔کتنے ہی ماہ وسال پل بھر میں گزر گئے۔وہ نازک سی کم آمیز، کم گولڑکی۔لاہور کی سڑکیں، شیزان، الحمرا ہال، جمخانہ کلب، این سی اے، لاہور کی ادبی محفلیں۔سب ایک فلم کی طرح ذہن کی سکرین پر نمودار ہو گئے۔

گلابوں جیسی خوش رنگ شبانہ یوسف سے ملاقات بھی اک خوشگوار حیرت تھی۔ لاہور کے بعد یہاں اس کا برسوں بعد اچانک مل جانا گویا دوگنی خوشی تھی۔ایسے لگ رہا تھا ہم کبھی جدا ہی نہیں ہوئے تھے۔بیچ کے برس بس یونہی گزر گئے خواب کی طرح۔اپنی اپنی زندگی کی دوڑ میں بھاگتے۔گزرے وقت کی خوشبو اور تتلیاں اب پھر ہماری مٹھی میں تھیں۔

بے ریا اور بے غرض دوستی کی خوشبو ہمیشہ قائم رہتی ہے۔زندگی میں ایسے لمحے ہی تو غنیمت ہوتے ہیں جب ہم پوری سچائی کے ساتھ ایسے لوگوں سے ملتے ہیں جن سے سچے جذبے اور رشتے جڑے ہوتے ہیں۔

مشاعرے کی صدارت کا منصب یشب تمنا صاحب نے سنبھالا۔راشد محمود اور منان قدیر منان مہمان اعزاز تھے۔

اقبال نوید صاحب نے بہت عمدہ انداز سے نظامت کا منصب نبھایا اور اپنے جملوں کی ظرافت سے محفل کو محظوظ کرتے رہے۔شعرائے کرام سجاد حیدر، شعیب افضال، جیم جازل اور ڈاکٹر ثاقب ندیم نے بہت عمدہ کلام سنایا۔

منان قدیر منان نے اردو اور سرائیکی کی ملی جلی غزل سنا کر سب کو حیران کر دیا یہ ایک نیا تجربہ تھا جس کو بہت پزیرائی ملی۔

ڈاکٹر ثاقب ندیم کی باوقار شخصیت اور شاعری اس محفل کی شان تھی۔ ان کی خوبصورت نظموں سے فیس بک پر متعارف ہو چکی تھی۔ پر تکلف کھانے کے بعد رخصت ہونے کی گھڑی تھی۔ دل چاہ رہا تھا وقت تھم جائے اور یہ محفل یوں ہی جاری رہے۔ ڈاکٹر ثاقب ندیم اور گلناز کوثر میری غزل گنگنا رہے تھے

اداس لوگوں سے پیار کرنا کوئی تو سیکھے
سفید لمحوں میں رنگ بھرنا کوئی تو سیکھے

دونوں کی آوازیں بہت اچھی تھیں گلناز نے بتایا ڈاکٹر ثاقب ندیم بہت اچھے گلوکار بھی ہیں۔ بار بار خدا حافظ کہنے کے باوجود سب وہیں رکے رہے۔ آخر طے پایا کہ تین ہفتہ بعد دوبارہ ملیں گے۔ اگلی محفل میں شاعری کے ساتھ موسیقی کا بھی اہتمام ہوگا مگر تین ہفتہ بعد کرونا کے باعث لاک ڈاؤن شروع ہو گیا جو اَب تک جاری ہے۔

افسانے

زندگی مجھ کو نئی پھر اک کہانی چاہیے
کچھ در و دیوار پر اور کچھ زبانی چاہیے
نیلما ناہید دُرّانی

نئے کرایہ دار

آغا جی نے علی پارک میں نئی کوٹھی بنائی تھی۔علی پارک۔رسول پارک،، پیر غازی روڈ اچھرہ۔اور سمن آباد کے درمیان آبادی تھی۔ابھی صرف چند گھر ہی بنے تھے۔ایک دو پرچون کی دکانیں تھیں ...... یہاں سب سے بڑا گھر ہمارا ہی تھا۔گیٹ کے سامنے گیراج ...... بائیں طرف لان میں انار، امرود، گلاب، موتیا، رات کی رانی مہندی اور کچنار کے درخت اور پودے تھے۔برامدے کے ساتھ گلابی پھولوں والی بھوگن بیل اور برامدے کی تین سیڑھیوں پر پام کے گملے رکھے تھے۔

ہم شام کی چائے اس برامدے میں بیٹھ کر پیتے تھے۔ساتھ گراموفون پر اپنی پسند کے ہیمنت کمار، منا ڈے، محمد رفیع، بشیر احمد، فردوسی بیگم، نور جہاں، لتا اور کے ایل سہگل کے گیت سنتے ...... یہاں سے سمن آباد کی طرف سے علی پارک آتی ہوئی سڑک دکھائی دیتی تھی جو ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ سے گزرتی ہوئی علی پارک کی اندرونی آبادی تک جاتی تھی۔ان دنوں چار دیواری زیادہ اونچی نہیں بنائی جاتی تھی گیٹ بھی اونچے نہیں ہوتے تھے اور دن بھر کھلے رہتے تھے۔نا تو دہشت گردی کا کوئی خطرہ تھا نا چوری ڈاکوں کی وارداتیں عام تھیں۔یوں ہم آنے جانے والوں کو بھی دیکھ سکتے تھے۔ آبادی کے لوگ گزرتے رہتے''۔اگر آغا جی ہمارے ساتھ ہوتے تو وہ آغا جی

السلام وعلیکم کہہ کر گزر تے...... ورنہ نظریں جھکا کر گزر جاتے...... موتیے اور رات کی رانی سے مہکتا یہ لان اور برامدہ کسی جنت سے کم نہیں تھا۔

ایک دن ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور ایک نوجوان لڑکی جس کی عمر اٹھارہ بیس برس رہی ہو گی سڑک سے گزریں۔ دوسرے روز وہ ایک گاڑی میں سامان کے ساتھ آ ئیں۔ پتہ چلا محلے میں نئے کرایہ دار آئے ہیں۔ صرف ماں بیٹی ہیں۔

لڑکی سانولی سلونی سی تھی مگر اس کے چہرے پر ملاحت اور معصومیت بلا کی تھی۔ دونوں ماں بیٹی سر پر دوپٹہ اوڑھے نظریں جھکائے گزرتیں۔ کبھی کبھی وہ لڑکی اکیلی ہوتی اور اس کے ساتھ ایک نہایت وجیہہ، دراز قد لانبی زلفوں والا شخص دکھائی دیتا جس کے ہاتھ میں 555 سگریٹ کی ڈبیا ہوتی۔ اور وہ ہمیشہ قیمتی لباس میں ملبوس ہوتا۔ وہ کون تھا۔ اس لڑکی سے اس کا کیا رشتہ تھا؟ اس سے ہمیں کچھ سروکار نہیں تھا۔

انھی دنوں بڑے آغا جی یعنی ہمارے دادا جان کو فالج کا اٹیک ہوا اور پھر کچھ دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ہم لوگ تدفین تک اپنے چچا کے گھر رہے۔ جب گھر واپس آئے تو پورے محلے میں ایک ہلچل مچی دیکھی۔

شام کو کچھ معززین محلہ آغا جی سے ملنے آئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ”یہ ماں بیٹی بدکردار ہیں۔ محلہ کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔ ان کے ہاں پرائے مرد آتے ہیں۔ ان کو محلے سے نکال دینا چاہئے“۔

آغا جی کھلے ذہن و دل کے مالک تھے۔ انھوں نے محلہ والوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ پہلے ان کو بلا کر پوچھ لینا چاہئے لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ آغا جی نے انھیں دلائل سے سمجھایا تو یہ طے ہوا کہ اس لڑکی اور اس کی ماں کو ہمارے گھر بلا کر ان کا موقف سنا جائے۔

وہ ایک عجیب شام تھی۔ محلے کے بزرگ اور جوان جمع تھے۔ کچھ بارِیش اور کچھ

کلین شیو......جن کے گھروں میں۔ماں،بہن،بیٹیاں موجود تھیں......ان کے درمیان وہ دونوں کسی مجرم کی طرح بیٹھی تھیں......ماں کہہ رہی تھی۔''ہم غریب ضرور ہیں۔مگر دھندہ نہیں کرتیں......میری بیٹی فلموں میں کام کرتی ہے۔۔وہ لڑکا فلم ڈائرکٹر ہے۔۔جو کبھی کبھار اسے چھوڑنے یا لینے آتا ہے......میں بیمار ہوں روزانہ اس کے ساتھ نہیں جا سکتی......''وہ رو رہی تھی گڑگڑا رہی تھی......لڑکی نے دوپٹہ کے پلو میں منہ چھپا رکھا تھا۔مگر کسی کو ان کی معصومیت اور مجبوری پر یقین نہیں آ رہا تھا......سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہ محلہ چھوڑ کر چلی جائیں۔کیونکہ ان کی موجودگی سے محلہ کا ماحول خراب ہونے کا خطرہ تھا......آغا جی اکثریت کی رائے کے آگے بے بس تھے۔

لڑکی کے آنسو ہچکیوں میں تبدیل ہو گئے۔دونوں ماں بیٹی نے ایک دوجے کا ہاتھ تھاما اور گھر سے باہر نکل گئیں......میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہی تھی......لڑکی نے جاتے ہوئے پلٹ کر دیکھا......اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کے سرخ ڈورے......میرے دل میں کسی تیز دھار خنجر کی طرح اتر گئے۔

پھر میں نے کبھی اس برآمدے میں بیٹھ کر چائے نہیں پی......موتیے اور رات کی رانی کی خوشبو عجب وحشت ناک بدبو میں بدل گئی......مجھے اپنے گھر سے خوف آنے لگا تھا۔

منے کی آپا اور اس کے مہمان

منے کی آپا کیا ہی طرح دار عورت تھی۔ مضبوط قد کاٹھ، سانولی رنگت۔ بائیں گال پان سے بھری ہوئی۔ سفید لٹھے کا غرارہ، کھلا سا کرتا، ململ کا گلابی دوپٹہ جس پر گوٹے کی دھنک اور ابرق کی چمک ہوتی۔ پہنے ہر وقت کاموں میں جتی رہتی......

سارے گھر کے اینٹوں والے فرش پر پوچا پھیرتی...... سل بٹہ پر مصالحہ پیستی، لکڑیاں جلا کر کھانا بناتی اور روٹی ہانڈی سے فارغ ہو کر اپنا کرتہ یا غرارہ سینے بیٹھ جاتی۔

منے کی آپا کے تین بیٹے تھے...... بڑا بیٹا خورشید بارہ، تیرا برس کا ہوگا۔ دوسرا بیٹا منا نو یا دس برس کا...... سب سے چھوٹا جبو چھ یا سات برس کا...... اس کا شوہر انارکلی میں کسی جوتوں کی دکان پر سیلز مین تھا...... یہ لوگ مہاجر تھے۔ ان کے خاندان کے اکثر لوگ کراچی میں تھے...... مگر یہ لاہور آ گئے...... بڑا بیٹا خورشید اپنے والد کے ساتھ کام پر چلا جاتا...... اور منے کی آپا سارا دن منے کو آوازیں دیتی رہتی...... ’’منے ادھر آؤ...... منے یہ لاؤ...... منے کہاں ہو‘‘ منا جو زیادہ وقت چھت پر جا کر آسمان پر اڑتی پتنگیں دیکھ رہا ہوتا...... جواب دیتا...... ’’آپا جی آ رہا ہوں‘‘

لہٰذا سارے محلے نے انھیں ’’منے کی آپا‘‘ کہنا شروع کر دیا۔

شوہر کی کم آمدنی کے باوجود منے کی آپا نے اپنے سلیقہ اور سمجھداری سے گھر کو خوشحال بنا رکھا تھا...... اتوار کا دن تو ان کے گھر میں دعوت کا سماں ہوتا...... سل بٹے پر قیمہ پیس کر شامی کباب بناتیں...... قورمہ اور بریانی بنا کر گویا وہ ہر اتوار کو اپنے شوہر کی دعوت کرتیں......

ان کے گھر سے کبھی کسی نے لڑائی جھگڑے کی آواز نہیں سنی تھی...... اس کا شوہر بھی بہت بھلا مانس تھا...... صبح سویرے گھر سے نکلتا۔ رات گئے واپس آتا...... محلے میں کسی سے کم ہی ملتا جلتا تھا......

جمعرات کو ان کے گھر سے قوالی کی آوازیں آتیں...... بڑا بیٹا خورشید ہر جمعرات کو داتا دربار جاتا۔ قوالی سن کر آتا اور پھر گھر آکر گانے کی پریکٹس کرتا......

ایک بار منے کے ماموں اور ممانی کراچی سے آئے...... وہ جتنے دن رہے ان کے گھر خوب رونق لگی رہی...... وہ روزانہ سبزیوں کے مختلف پکوان بنوا کر کھاتے...... ان کا کہنا تھا وہ سبزیاں کھانے پنجاب آئے ہیں...... کیونکہ کراچی میں ایسی تازہ سبزیاں نہیں ملتیں......

بھائی، بھابھی کے جانے کے بعد۔ منے کی آپا کا وہی معمول لوٹ آیا۔ صبح اٹھ کر ناشتہ بنانا...... گھر کی صفائی کرنا۔ کھانا بنانا...... اپنے لیے ململ کے دوپٹے کو گلابی رنگ میں رنگنا۔ گوٹا لگانا۔ ابرق لگانا۔ اپنے لیئے ہاتھ سے کرتہ یا غرارہ سینا...... وہ نا تو پڑوس میں کسی کے گھر جاتی تھی۔ اور نا ہی کوئی ہمسائی اس سے ملنے آتی...... وہ اپنی گھر داری میں ہی مگن رہتی......

ایک دن اس کی کوئی دور کی رشتہ دار عورت اپنی نوجوان بیٹی کے ساتھ ان کے گھر رہنے آگئی...... بیٹی دبلی پتلی دھان پان گویا اللہ میاں کی گائے ہو...... اماں دوہرے بدن کی بیباکی سے ہر ایک سے بات کرنے والی...... بات بے بات قہقہے

لگانے والی۔کچھ دنوں بعد ایک نوجوان لڑکا بھی آنے لگا۔کسی نے بتایا یہ ماں بیٹی کراچی سے آئی ہیں۔لڑکا،لڑکی کا منگیتر ہے......لاہور شادی کے لیے آئے ہیں۔شادی کے بعد چلے جائیں گے......

لڑکی اپنے منگیتر سے پردہ کرتی تھی......وہ سارہ دن گھر کے پچھلے کمرے میں بیٹھ کر بستر کی چادروں اور تکیے کے غلافوں پر ریشم کے دھاگوں سے پھول کاڑھتی رہتی......

وہ عورت اور لڑکا برآمدے میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے۔منے کی آپا اپنے مہمانوں کے لئے چائے،کھانا تیار کرتی رہتی......وہ دونوں روزانہ شادی کی شاپنگ کے لیے بھی جاتے۔واپسی پر وہ عورت بہت سارے ڈبے اٹھا کر آتی......شادی کے دن قریب آرہے تھے......بیٹی جتنی کم گو،کم آمیز اور شرمیلی تھی......ماں اتنی ہی بیباک، چاق وچوبند اور پھرتیلی تھی......وہ محلے بھر کے گھروں میں بھی گھومتی۔سب کو اپنی بیٹی کی شادی کی تیاریوں کے بارے میں بتاتی......یہ معمول کئی ہفتے جاری رہا......ایک روز وہ شاپنگ کرنے گئے مگر واپس نہ آئے......منے کی آپا نے سر پیٹتے ہوئے بتایا......کمبخت نے اپنی ہی بیٹی کا گھر بسنے سے پہلے اجاڑ دیا ہے......دونوں شادی کر کے کہیں چھپ گئے ہیں......

تکیے کے غلافوں پر پھول کاڑھتی لڑکی پر کیا گزری......کسی کو معلوم نا ہو سکا......وہ گھر کے پچھلے کمرے میں ہی بیٹھی رہی......

ایک دن منے کی آپا نے شامی کباب بنائے،قورمہ اور بریانی بنائی......مولوی صاحب کو بلا کر......اپنے بیٹے خورشید سے اس کا نکاح کروا دیا......

جونز آف انگلینڈ

پچھلے تین برسوں سے جن دنوں میں انگلینڈ میں ہوتی ہوں۔ روزانہ اپنی گھریلو معمولات سے فارغ ہو کر واک کے لیے ہائی سٹریٹ تک جاتی ہوں...... کچھ دیر وہاں بیٹھ کر کبوتروں کو دانہ ڈالتی ہوں۔ پھر دودھ ڈبل روٹی اور اشیائے ضرورت خرید کر واپس گھر آ جاتی ہوں۔ گھر سے ہائی سٹریٹ تک پندرہ منٹ کی واک ہے۔ یوں میں آنے جانے میں آدھا گھنٹہ پیدل چل لیتی ہوں۔ جو میرا پسندیدہ مشغلہ بھی ہے اور ایکسرسائز بھی......

کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ میرے راستے میں سڑک کے دوسری جانب ایک گھر کی بالکونی پر 80 یا 85 سالہ ایک شخص جنگلے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوتا ہے...... میں اس کی طرف دیکھے بنا گزر جاتی۔

میری توجہ نیلے آسمان پر اڑتے بادلوں کی طرف ہوتی۔ یا موسم سرما میں رنگ بدلتے درختوں پر...... کبھی کبھی میں رک کر ان کی تصویریں بناتی......

ایک دن جیکٹ اور مفلر میں لپٹے اس شخص نے ہاتھ ہلایا...... میں نے اردگرد دیکھا...... سڑک پر میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ میں اسے اپنا وہم سمجھ کر آگے بڑھ گئی......

دوسرے دن وہ پھر جنگلے سے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں نے بھی جواب میں ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گئی...... مجھے معلوم تھا کہ یہاں بہت سے گھروں میں ایسے بزرگ رہتے ہیں۔ جو تنہائی کا شکار ہیں۔ کوئی ان سے ملنے نہیں آتا۔ کوئی ان سے بات چیت نہیں کرتا۔ لہٰذا اپنے گھروں میں بند ہو کر قید تنہائی کا شکار رہتے ہیں۔ اس لیے ان کے لیے ایک مسکراہٹ ایک ہاتھ ہلانا کتنی خوشی کا باعث ہو سکتا ہے۔۔

وہ گھر سڑک کے دوسری طرف تھا اس لئے اس کی شکل وصورت واضح طور پر دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔

ایک دن اس نے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سوچا شاید اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔۔ میں اس کے گھر کے قریب چلی گئی...... وہ بالائی منزل کی بالکونی پر جھکا ہوا تھا۔

''میرا نام جونز ہے۔ میں انگلینڈ میں رہتا ہوں''

''آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟''

''پاکستان''

میرا جواب سنتے ہی اس کی آنکھوں کی چمک ختم ہو گئی۔ چہرے پر ناگواری کے اثرات آ گئے

''آپ انگلینڈ میں رہتی ہو''

''نہیں میں وزیٹر ہوں'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گئی...... مجھے محسوس ہوا اس کو میرا پاکستانی ہونا اچھا نہیں لگا۔ اس کا تعلق اس نسل سے تھا جو برصغیر پر حکمران رہی تھی۔ اور خود کو اب بھی حاکم تصور کرتی تھی......

اس دن کے بعد وہ پھر کبھی بالکونی میں دکھائی نہیں دیا......

کئی مہینے گزر گئے...... میرا پیدل چلنے کا معمول جاری رہا...... ایک دن ایک

سفید بالوں والی خوش لباس خاتون ایک بزرگ کو سہارا دیتے ہوئے میرے راستے میں آئی ...... میں ان کو راستہ دینے کے لیے ایک طرف رک گئی...... اس خاتون نے اس شخص کو گھر کا راستہ دکھایا...... خدا حافظ کہا اور میرے ساتھ چل پڑی...... وہ ایک خوش مزاج انگریز خاتون تھی...... خود ہی گویا ہوئی...... ''یہ جونز ہے...... بیچارہ اپنی یاداشت کھو بیٹھا ہے۔۔اس کو گھر کا راستہ بھی یاد نہیں رہتا...... میں اس کو اس کے گھر تک چھوڑنے آئی تھی''۔

وہ مارکیٹ تک چلتے ہوئے اس کی حالت پر اظہار افسوس کرتی رہی......

میں روزانہ اس راستے سے گزرتی رہی...... جونز پھر کبھی دکھائی نہیں دیا...... اس کے گھر کی بالکونی بھی خالی ہوتی......

ایک دن اس گھر کے آگے ایک ایمبولینس کھڑی دکھائی دی۔جس میں سے چار آدمی نکل کر جلدی سے اس عمارت میں داخل ہوئے...... یہ شاید جونز کے آخری مہمان تھے۔جو اس کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے آئے تھے......

مارگریٹا

مال کے مشہور برانڈ سٹور کے فٹنگ روم سے ایک خوبصورت خاتون باہر آئی۔ اس نے لال پھولوں والا سفید فراک پہن رکھا تھا۔ میرے قریب کھڑے نوجوان کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ پھر لہرا کر پوچھا ''کیسی لگ رہی ہوں؟'' ...... نیلی آنکھوں اور ستواں ناک والی یہ خاتون 60 یا 65 برس کی رہی ہوگی۔ لیکن سرخ وسفید رنگت اور سنہری بالوں نے اس کے حسن کو ماند نہیں پڑنے دیا تھا...... میرے قریب کھڑا لڑکا 35 برس کا رہا ہوگا۔ شکل وشباہت سے ایشین لگ رہا تھا...... اس نے جھینپتے ہوئے اس عورت کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا...... وہ خوشی سے اٹھلاتی ہوئی دوبارہ فٹنگ روم میں گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلی۔ کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے فراک بیگ میں ڈالا۔ اور وہ دونوں دکان سے باہر چلے گئے۔

ابھی کچھ دن ہی گزرے تھے کہ وہ دوبارہ دکھائی دیئے۔ شہر کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے...... یہ سویڈن کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ میں اپنے بیٹے سے ملنے آئی تھی جو یہاں یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔

ایک دن میں لائبریری میں بیٹھی تھی کہ وہ دونوں لائبریری میں داخل ہوئے۔ وہ چلتی ہوئی میرے پاس آ گئی ''میں اس میز پر بیٹھ جاؤں'' اس نے پوچھا اور میرے ہاں کہنے پر وہ میرے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی ''میرا نام مارگریٹا ہے اور یہ جو لڑکا

میرے ساتھ ہے، میرا بوائے فرینڈ ہے''۔ اب میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ لڑکا کتابوں کے شیلف سے کوئی کتاب ڈھونڈ رہا تھا۔

''اس کا نام نقوی ہے...... یہ آپ کے ملک کا رہنے والا ہے۔۔ یہ سویڈش سیکھنے کے لیے کتاب ڈھونڈنے آیا ہے''۔۔۔ وہ یہ ساری باتیں مجھے اس لیے بتا رہی تھی کہ وہ مجھ سے میرے ملک کے بارے میں لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتی تھی...... '' میری ایک بیٹی ہے وہ دوسرے شہر میں رہتی ہے۔ کبھی کبھار مجھے ملنے آتی ہے...... کسی دوسرے شہر میں ہے...... میں بالکل اکیلی ہوں...... اس سے پہلے میرا ایک بوائے فرینڈ تھا...... وہ عراق سے آیا تھا...... میں نے اس کو 4 سال اپنے گھر رکھا...... اس کا خرچہ اٹھایا...... جب اس کو یہاں کی سکونت مل گئی۔ تو وہ کہنے لگا...... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ لیکن اب میں گھر بسانا چاہتا ہوں...... مجھے بچوں کی ضرورت ہے۔ جو تم نہیں دے سکتی۔ اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا......''

''یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر گہری اداسی چھا گئی۔ نیلی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے...... اور اب یہ آیا ہے۔ نقوی...... تم لوگ کیسے ہو...... سنا ہے مشرقی لوگ وفادار ہوتے ہیں...... احسان فراموش نہیں ہوتے...... ساتھ نبھانا جانتے ہیں''۔

مارگریٹا...... ایک معصوم بچی کی طرح مجھ سے پوچھ رہی تھی...... میں اپنے دل میں چھپے خوف سے لرز رہی تھی...... ''کہ اے بھولی نیک دل خاتون...... تم اب پھر وہ خواب دیکھ رہی ہو...... جس کے ٹوٹنے کے بعد شاید تم میں دوبارہ خواب دیکھنے کی ہمت نہ رہے......''۔ نقوی کتاب لے کر واپس آ گیا تھا۔ وہ دونوں خدا حافظ کہہ کر لائبریری سے باہر نکل گئے۔ مجھے آج بھی مارگریٹا کی نیلی آنکھوں سے چھلکتے آنسو اکثر بیتاب کر دیتے ہیں اور میں اس کی خوشی کے لئے دعا مانگتی ہوں...... ایسی دعا جس کی قبولیت کا مجھے بھی یقین نہیں۔

برفباری اور سنہرے بالوں والا

ایک ہفتہ سے مسلسل برفباری ہو رہی تھی۔۔ کھڑکی کے باہر گویا ہر طرف چاندی بچھی تھی۔ درجہ حرارت منفی پچیس ڈگری تک پہنچ گیا تھا...... دور سرمئی سڑک پر اکا دکا ٹریفک دکھائی دیتی تھی...... روزانہ جگمگ کرتی گسڑیاں رات کو اس سڑک پر نمک پاشی کرتی تھیں تا کہ ٹریفک رواں رہے...... آمدورفت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

ہمارے لونگ روم کی کھڑکی سے یہ منظر دکھائی دیتا تھا...... جبکہ کچن اور بیڈ رومز کی کھڑکیاں چرچ اور اس سے ملحقہ قبرستان کی طرف کھلتی تھیں۔ جمعہ اور اتوار کے علاوہ جب بھی چرچ کی گھنٹیاں بجتیں تو اندازہ ہو جاتا اس گورستان میں کوئی نیا مہمان آیا ہے۔ دوسرے روز جب ہم وہاں سے گزرتے تو تو تازہ مٹی کے سرہانے پھول دکھائی دیتے۔ جن کے ساتھ ایک صلیب بھی گڑی ہوتی۔ گرمی کے موسم میں جلد ہی اس پر گھاس اگ جاتی۔ یہ ساری قبریں زمین کی سطح پر ہموار تھیں۔ سارا قبرستان ہرا بھرا تھا۔ بڑے بڑے سایہ دار درخت...... درمیان میں پکے راستے...... ایک خوبصورت باغ کی طرح سجا سجایا۔ سردیوں میں یہ بھی برف کی تہوں میں چھپ جاتا۔

ہم اپنے لونگ روم میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے سبز قہوے کے ساتھ خشک میوے کھاتے اور دور سرمئی سڑک سے گزرنے والی ٹریفک کو دیکھتے رہتے......

روزانہ صبح سویرے ایک لڑکی لال جیکٹ، نیلی جینز پہن کر گزرتی......ٹوپی نے اس کا چہرہ چھپا رکھا ہوتا......مگر اس کے سنہرے بال اس کی کمر تک لہرا رہے ہوتے......وہ شاید اپنی ڈیوٹی پر جانے کے لیے بس اسٹاپ کی طرف جاتی تھی......۔

ایک روز میں نے اپنے بیٹے کو بتایا کہ ایک لڑکی روزانہ شدید برفباری میں بھی اپنی ڈیوٹی پر جانے کے لیے پیدل یہاں سے گزرتی ہے......

اس نے کہا ''میں نے تو کوئی لڑکی نہیں دیکھی''

میں نے کہا ''اچھا اب گزرے گی تو بتاؤں گی''

اب میں اس لڑکی کا انتظار کرنے لگی......کچھ دن وہ دکھائی نہیں دی۔

آخر ایک دن وہ پھر سڑک کی طرف جاتی دکھائی دی......میں نے بیٹے کو آواز دی

''وہ دیکھو لال جیکٹ اور سنہرے بالوں والی لڑکی......''

میرے بیٹے نے آ کر کھڑکی سے جھانکا

''کہاں ہے لڑکی؟''

''وہ جو اب سڑک کے قریب پہنچ چکی ہے''

''وہ تو ایک لڑکا ہے......ہمارے نیچے والے فلیٹ میں رہتا ہے......کل مجھ سے پیسے مانگ رہا تھا......کام پر نہیں گیا تھا......''

وہ بس اسٹاپ پر کھڑا تھا......میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی......لمبے سنہرے بال اس کی پشت پر لہرا رہے تھے۔

ہمارے ساتھ والے فلیٹ میں ایک نوجوان اپنے کتے کے ساتھ رہتا تھا......

جب ہمارے سونے کا وقت ہوتا......اس کا کتا چاؤں چاؤں کرنے لگ جاتا......

جب اس کی آواز بلند ہونے لگتی تو وہ اس کی زنجیر تھام کر برفباری میں اس کو رفع حاجت کروانے گھر سے باہر لے جاتا......

وہ روزانہ یہ ڈیوٹی اتنے صبر اور استقامت سے دیتا کہ اس کی کتا نوازی پر حیرت ہوتی......

کچھ دنوں بعد وہ فلیٹ خالی کر گیا......اب اس فلیٹ میں ایک نوعمر جوڑا رہنے کے لیے آیا......ان کا ایک پانچ یا چھ ماہ کا بچہ بھی تھا۔

وہ بچہ گیلا ہونے پر روتا رہتا......اور وہ دونوں اس بات پر بحث کرتے رہتے کہ اس کا nappy کون بدلے گا......!!!

نبراسکا کا ڈین ہیرش

پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس سے یونیورسٹی کی بس پر سوار ہوئی تو منظر ہی عجیب تھا......بس کی سیٹوں پر طلبا کی جگہ کچھ غیر ملکی براجمان تھے۔ میں واپس اترنے لگی تو ڈرائیور نے کہا......"بی بی آپ بیٹھ جائیں۔ ان کو اتار کر یہ بس نیو کیمپس ہی جائے گی......میں ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ غیر ملکیوں کی تعداد دس کے قریب تھی۔ تین لوگ یونیورسٹی انتظامیہ کے بھی تھے جن میں ایک خاتون بھی تھی......

ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ایک دراز قد، دبلا پتلا شوخ وشنگ لڑکا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا......"میرا نام جم ہے۔ آپ مجھے جمی کہہ سکتی ہیں۔ ہم لوگ امریکہ کی ریاست نبراسکا سے آئے ہیں۔ ہم سب تعلیم کے شعبہ سے وابستہ ہیں...... یہ ہمارا پاکستان کا سٹڈی ٹور ہے......"

باری باری سب نے اپنا تعارف کروایا۔ وہ سب لاہور کی تاریخی عمارات، کھانوں اور ثقافت کے بارے میں بہت پر جوش تھے......

ابھی یہ لوگ الحمرا ہال کے عقب میں پنجاب کارپٹس میں قالین اور قالین بافی دیکھنے جا رہے تھے......اس کے بعد انھوں نے ڈیوس روڈ پر پاکستان ہینڈی کرافٹس دیکھنے جانا تھا...... جب بس پنجاب کارپٹس کے قریب رکی تو یونیورسٹی انتظامیہ میں

موجود خاتون نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی...... جو میں نے قبول کرلی......

خوبصورت رنگوں کے قالین دیکھتے کاریگروں کے فن کو سراہتے ہم سب اس طرح گھل مل گئے جیسے برسوں سے اک دوجے سے آشنا ہوں......

ہینڈی کرافٹس شاپ سے انھوں نے خریداری بھی کی۔ پھر انھیں ایمبیسڈر ہوٹل اتار دیا گیا۔ جہاں ان کی رہائش کا انتظام تھا...... اب بس نیو کیمپس روانہ ہوئی۔ عملے کے لوگوں نے بھی وہاں جانا تھا...... انھوں نے بتایا کہ یہ لوگ مزید دو روز لاہور میں ہیں۔ اور خواہش ظاہر کی کہ میں ان دو دنوں میں ان کا ساتھ دوں...... میں نے اثبات میں سر ہلایا اور خدا حافظ کہہ کر ہوسٹل کے اندر چلی گئی......

دوسرے روز میں اولڈ کیمپس پہنچی تو فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے باہر بس تیار تھی۔ سب لوگ بس میں سوار ہو چکے تھے...... ڈین ہیرش قریب والی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ درمیانے قد، دوہرے بدن براؤن آنکھوں والا جو گزشتہ روز سب سے الگ ـــــــ چپ چپ رہا تھا۔

''آپ بس میں نہیں جا رہے۔؟'' میں نے پوچھا

''میرے ساتھی شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں۔ مگر میں کچھ جگہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری مدد کر سکتی ہیں۔؟'' اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے نقشے دکھاتے ہوئے کہا......

میں نے ایک نظر نقشوں پر ڈالی۔ یہ لاہور کی تاریخی عمارات تھیں۔ بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نور جہاں......

''ہمارے پاس صرف دو دن ہیں اور میں یہ جگہیں دیکھنا چاہتا ہوں''۔

ٹھیک ہے میں آپ کی گائیڈ بن جاتی ہوں''۔

بس اس کے ساتھیوں کو لے کر روانہ ہوگئی۔ ہم نے سڑک پر جا کر رکشہ لیا اور

بادشاہی مسجد پہنچ گئے۔

ڈین ہیرش بڑی توجہ سے ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ تصاویر بنا رہا تھا...... بادشاہی مسجد، مزار اقبال، حضوری باغ کے بعد ہم شاہی قلعہ میں داخل ہوئے۔ دیوان عام، دیوان خاص، موتی مسجد، شیش محل کے بعد میں اس کو سکھ میوزیم لے گئی۔ جہاں بہت بڑی بڑی پینٹنگز لگی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر، شہزادہ جواں بخت، مہاراجہ رنجیت سنگھ، شیر سنگھ اور مہاراجہ دلیپ سنگھ۔

میں اس کو سب کے بارے میں بتا رہی تھی...... جب میں دوسری بار دلیپ سنگھ کی تصویر کے پاس گئی تو وہ شرارت سے مسکرایا...... ''اس تصویر میں کیا خاص ہے؟'' ''یہ تصویر مجھے سب سے زیادہ پسند ہے''۔ میں نے کہا ''اگر کوئی میرے خوابوں کا شہزادہ ہوگا تو وہ ایسا ہوگا''۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ''خواب دیکھنا اچھی بات ہے'' اس نے کہا۔ اور ہم میوزیم سے باہر نکل آئے۔

شام ہو چکی تھی۔ ہم نے رکشہ لیا۔ اس نے مجھے میرے ہاسٹل کے باہر اتارا...... اور کہا۔ ''کل پھر ملتے ہیں۔ اولڈ کیمپس فائین آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے باہر''۔

دوسرے دن ہم شاہدرہ میں واقع مقبرہ جہانگیر پہنچے۔ مغلیہ تاریخ میرا پسندیدہ مضمون رہا تھا۔ میں اس کو عدل جہانگیر اور زنجیر عدل کے بارے میں بتاتی رہی...... ہم نے آصف جاہ کا مقبرہ بھی دیکھا جس کے گنبد پر گدھ منڈلا رہے تھے......

نور جہاں کے مقبرے پر بھی گئے جہاں ویرانیوں کا ڈیرا تھا...... اس کی قبر کے کتبے پر یہ شعر کندہ تھا......

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

میں نے اس کو شعر کا مطلب سمجھایا...... جس کو سن کر وہ اداس ہو گیا...... اس نے

اپنے بٹوے سے نکال کر اپنی بیوی اور بچوں کی تصاویر دکھائیں......دو پیارے پیارے گول مٹول بچے......اور نیلی آنکھوں والی پریوں جیسی لڑکی جو اس کی بیوی تھی......اس نے کہا وہ اپنے بچوں اور بیوی کے لیے کچھ خریدنا چاہتا ہے......خاص طور پر بیوی کے لیے پیور سلک کا نیلے رنگ کا کپڑا......کیونکہ جب وہ نیلے رنگ کے کپڑے پہنتی ہے تو اس کی آنکھوں کا رنگ زیادہ گہرا ہو جاتا ہے......اپنی بیوی اور بچوں کا ذکر کرتے ہوئے اور ان کی تصاویر دیکھتے ہوئے وہ بہت جذباتی ہو گیا تھا......ڈین ہیرش نے بتایا کہ اس کی ایک کزن ہالی وڈ فلموں میں کام کرتی ہے......نیز یہ کہ اس کے خاندان کے لوگ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہتے......اس کا والد، چچا، دادا سب 35 سال سے کم عمر میں وفات پا گئے تھے......وہ بھی جلد مر جائے گا......

میں نے کہا ”یہ ضروری تو نہیں......ہوسکتا ہے تم سو برس سے بھی زیادہ زندہ رہو“......جس پر وہ ھنس پڑا......

وہاں سے ہم انارکلی بازار آئے......اس نے بچوں کے کھلونے، نیلا سلک کا کپڑا اور ایک پرفیوم خریدی......

شام ہو رہی تھی ایک گھنٹے بعد انھوں نے ایئر پورٹ روانہ ہونا تھا۔ میں اس کے ساتھ ایمبیسیڈر ہوٹل گئی۔ اس کے تمام ساتھی لابی میں موجود تھے......انتظامیہ والے بھی تھے......ڈین ہیرش اپنے کمرے میں سامان لینے چلا گیا۔ میں لابی میں دوسرے لوگوں کے پاس رک گئی۔

جب سب لوگ اپنا اپنا سامان اٹھا کر بس کی طرف جا رہے تھے......ڈین ہیرش نے پرفیوم کی شیشی مجھے پکڑا کر میرا شکریہ ادا کیا......عجیب اداسی کی لہر نے میرے رگ و پے کو منجمد کر دیا تھا......میں خدا حافظ بھی نا کہہ سکی......بس کے قریب پہنچ کر اس نے مجھے مڑ کر دیکھا اور کہا......”ایک دن تمہیں تمہارا دلیپ سنگھ ضرور ملے گا......!“

ناصر خان درانی
انسپکٹر جنرل آف پولیس ریٹائرڈ

نیلما...... پولیس آفیسر اور ''تیز ہوا کا شہر''

نیلما ناہید کا تعارف دو زاویوں سے ہے۔ ایک ادب کے حوالے سے اور دوسرا پولیس کے حوالے سے۔ میرا ان سے تعارف پولیس کے حوالے سے رہا۔

1996ء میں پنجاب پولیس میں خواتین پولیس آفیسرز کے لیے ایک ٹریننگ سکول کا آغاز ہوا تو انہیں اس سکول کا پہلا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ میں اس وقت پولیس کی تربیت کے امور کا نگران تھا۔ اس سکول کی تشکیل اور ابتدائی مراحل کے دوران نیلما ناہید درانی کی شخصیت کے ادبی حوالوں سے بھی واقفیت ہوئی۔

پولیس میں ان کی شہرت ایک باوقار، وضع دار اور خوددار آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری اور کالم نگار کے حوالے سے بھی تھی۔

پولیس نے ان کی ہمہ جہت خوبیوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ ٹریننگ سکول میں آفیسرز کو پیشہ ورانہ امور کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور ادب سے روشناس کروانے کے لیے ملک کے نامور ادیبوں اور دانشوروں کو مدعو کیا جاتا جو اپنے تجربات و مشاہدات سے زیر تربیت آفیسرز کو آگاہی دیتے۔

بظاہر پولیس اور ادب کا کوئی ربط نہیں لگتا لیکن اگر غور کیا جائے تو ایک اچھے پولیس آفیسر کے لیے مشاہدات، انسانی احساسات اور جذبات کا ادراک اتنی ہی

ضروری ہے جتنا کسی ادیب کے لیے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ادیب ان انسانی رویوں اور مشاہدات کو خوبصورت پرائے میں بیان کر دیتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ محکمہ پولیس کو نیلما ناہید کے ادیب ہونے کا فائدہ پہنچا ہے اور ان کے ادب کو پولیس کے پیشہ ورانہ امور نے نکھار بخشا ہے۔

ادب کو تخلیق کے حوالے سے بہت سے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جیسے ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے اصلاح'' ...... لیکن میرے خیال میں ادب کو ''کمرشل ادب'' اور ''الہامی ادب'' میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

کمرشل ادب سے میری مراد وہ ادب ہے جو کوئی ادیب معاوضے کو مدنظر رکھتے ہوئے تخلیق کرے جس کی منڈی میں مانگ ہو جبکہ الہامی ادب سے مراد وہ ادب ہے جس میں ادیب دل و دماغ پر گزری ہوئی کیفیات کو تخلیق کرے۔

میرے نزدیک نیلما ناہید کا تعلق ادب کی دوسری صنف سے ہے۔ انہوں نے جو محسوس کیا، اس کو شاعری اور نثر دونوں میں ایمانداری سے بیان کیا۔ ان کی تحریروں میں اداسی اور تنہائی کے عناصر نمایاں ہیں۔ تاہم مجھے ان کی یہ بات متاثر کرتی ہے کہ انہوں نے اپنے اظہار کو ہماری معاشرتی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان کیا۔

ادب میں ان کی شہرت اور مقبولیت کا مستند حوالہ ان کی شاعری رہی ہے۔ تاہم انہوں نے افسانے، مضامین اور سفرنامے بھی تحریر کیے۔ زیرِ نظر کتاب "تیز ہَوا کا شہر" ان تینوں اصناف پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے باکو آذربائیجان کی سیاحت کے دوران اپنے مشاہدات کو نہایت خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جس سے قاری خود کو بھی ان جگہوں پر پھرتا محسوس کرتا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں چند مضامین شامل ہیں جو ان شخصیات پر تحریر کیے گئے ہیں جو اُن کے بزرگان اور وہ لوگ جن سے ان کی ذاتی آگاہی اور شناسائی تھی۔

ان کا پہلا مضمون اپنے دادا مرحوم پر ہے جو خود بھی علمی اور ادبی ذوق رکھتے تھے۔ شاعر محسن نقوی اور ایرانی سفارتکار آقائی صادق گنجی کے بارے میں مضامین شامل ہیں۔

کتاب کے آخری حصے میں انہوں نے چند افسانے تحریر کیے ہیں جن میں بیشتر کردار حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ گو ہمارے روایتی افسانوں میں رومان زیادہ نمایاں نظر آتا ہے لیکن انہوں نے روزمرہ واقعات اور رہن سہن میں ہی خوبصورتی پیدا کی ہے جسے پڑھتے ہوئے خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔

نیلما ناہید کی شاعری ہو یا نثر ان کی تحریروں میں پنجاب کی مٹی کی خوشبو ہمیشہ نمایاں لگتی ہے اور اس دھرتی کے تاریخی کرداروں کا ذکر بھی نظر آتا ہے۔ خاص طور پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے دلیپ سنگھ سے ان کا افسانوی رومان محسوس ہوتا ہے۔

نیلما ناہید کی کتاب "تیز ہَوا کا شہر" ایک اچھی اور دلچسپ کتاب ہے جس میں انسان دورانِ سفر یارات کو سونے سے پہلے پڑھ کر محظوظ ہو سکتا ہے۔

۲۴ دسمبر ۲۰۲۰ء

پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم
الازہر یونیورسٹی، قاہرہ، مصر

نیلما کی کتاب ”تیز ہَوا کا شہر“

جب شاعرہ اور ادیبہ نیلما ناہید درانی نے اپنی نئی کتاب ”تیز ہَوا کا شہر“ کا فلیپ لکھنے کو کہا تو میں فکر مند ہوا، اس لیے کہ میں ایک طرف نہ تو ان کو براہِ راست جانتا تھا اور نہ ہی میں کوئی اتنی معروف شخصیت ہوں کہ میرے فلیپ لکھنے سے ان کی کتاب کی قدر میں کوئی اضافہ ہو جائے گا، اس سے بڑھ کر میں ایسا شخص ہوں جس کی زبان اردو نہیں، بلکہ عربی ہے، اور اردو لکھنے پر کوئی خاص عبور حاصل نہیں۔ دوسری طرف میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے ان کی شاعری یا افسانوں کا کوئی مجموعہ پڑھا ہے، تو میں فلیپ کیسے لکھوں؟ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اہمیت ادیب یا شاعر کی نہیں بلکہ اس کی شعری یا نثری تخلیقات کی ہوتی ہے جو لوگوں کے سامنے ہیں لہٰذا میں کیوں نہ کتاب پڑھوں اور پھر دیکھوں کہ کیا لکھوں؟

میں نے کتاب ”تیز ہَوا کا شہر“ پڑھنا شروع کی، اور ایک ہی نشست میں میں نے کتاب پڑھ ڈالی۔ پڑھتے پڑھتے مجھے محسوس ہوا گویا کہ ایک طرف نیلما صاحبہ سے میرا تعارف گہرا ہوتا جا رہا ہے اور دوسری طرف پاکستانی معاشرے کی تاریخ کا ایک ایسا حصہ مجھے دکھائی دے رہا ہے جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے پاکستان میں دیکھا۔ انہوں نے بہت ساری ایسی جگہوں کا ذکر کیا جہاں میں خود رہا۔

ایسی شخصیتوں کا ذکر آیا جن سے میں خود ملا اور ان سڑکوں کا ذکر کیا جن پر میں خود آتا جاتا رہا۔ اس لیے مجھے ان سے قربت کا احساس ہوا۔ ان کا اندازِ تحریر اتنا آسان، سہل اور پرکشش ہے کہ پڑھتے وقت آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کے ایک محبت بھرے فرد کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں جو آپ کو ایسے واقعات اور ایسی یادیں ایسے طریقے سے سنا رہا ہے کہ جو محو نہ ہونے کے لیے آپ کے دل کی گہرائیوں میں گوشہ نشیں ہوتی چلی جاتی ہیں۔

حقیقت میں کتاب "تیز ہَوا کا شہر" بہت لطف دینے والی ہے۔ زبان بہت خوبصورت، میٹھی اور مصنفہ بہت پروقار اور پرتہذیب شخصیت کی مالک ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اردو ادب کے ورثے میں ایک متعدبہ اضافہ ہے۔

۱۸ جنوری ۲۰۲۱ء

اداکار، کہانی کار اور شاعر ''عرفان خان'' کے لیے ایک نظم

یہ گاڑی کیوں اچانک رک گئی ہے
یہاں کوئی ''سٹیشن'' تو نہیں ہے
دھواں ڈبے میں بھرتا جا رہا ہے
مناظر کھڑکیوں میں جم گئے ہیں
مجھے تم کیوں بلانے آ گئے ہو
میرا جانا ابھی ممکن نہیں ہے

....

وہ میری میز پر قلمیں دھری ہیں
جو ادھوری ہیں
قلم میں اک کہانی منتظر ہے
در و دیوار پر کچھ گیت اور کچھ خواب لٹکے ہیں
میرے بچوں کے خوابوں کو ابھی تعبیر ہونا ہے
مجھے وہ گیت لکھنے ہیں جنہیں تصویر ہونا ہے
مجھے اس گھر میں جینا ہے جسے تعمیر ہونا ہے

....

مجھے تم کیوں بلانے آ گئے ہو
یہ گاڑی کیوں اچانک رک گئی ہے
یہاں کوئی ''سٹیشن'' تو نہیں ہے

نیلما ناہید درّانی

میں سمجھتا ہوں کہ محکمہ پولیس کو نیلما ناہید درانی کے ادیب ہونے کا فائدہ پہنچا اور اُن کے ادب کو پولیس کے پیشہ ورانہ امور نے نکھار بخشا۔

ادب کو تخلیق کے حوالے سے بہت سے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جیسے ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے اصلاح''۔

میرے خیال میں ادب کو ''کمرشل ادب'' اور ''الہامی ادب'' میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ کمرشل ادب سے میری مراد وہ ادب ہے جو ادیب معاوضے کو مدنظر رکھتے ہوئے تخلیق کرے، جس کی منڈی میں مانگ ہو اور الہامی ادب سے مراد وہ ادب ہے جس میں ادیب دل اور دماغ پر گزری ہوئی کیفیات کو تخلیق کرے۔

میرے نزدیک نیلما ناہید درانی کا تعلق ادب کی دوسری صنف سے ہے۔ انھوں نے جو محسوس کیا اس کو ایمانداری سے بیان کیا۔ اُن کی تحریروں میں اداسی اور تنہائی کے عناصر نمایاں ہیں، تاہم مجھے ان کی یہ بات متاثر کرتی ہے کہ انھوں نے اپنے اظہار کو ہماری معاشرتی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔

ناصر خان درانی

انسپکٹر جنرل آف پولیس (ریٹائرڈ)

۲۴ دسمبر ۲۰۲۰ء